باب چہارم

گریز کی راہیں

خواہش فرار کا دباؤ

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے فریضۂ حیات کی جواب دہی کا پورا احساس ہو، نیز جسے اس بات کا یقین ہو کہ کلام الٰہی جو کچھ فرماتا ہے، عروج و زوال اور عزت و ذلت کا جو فلسفہ بتاتا ہے وہ انسانی عقل کے گھڑے ہوئے فلسفوں کی طرح گمان اور قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد حقیقت نفس الامری پر رکھی گئی ہے، وہ حق ہے اور سراپا حق ہے، ایسے شخص کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ قابل اختیار رہ ہی نہیں جاتی کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے نفس کے ہر فریب اور شیطان کے ہر وسوسے سے دل کو پاک کر کے اور تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر صراط مستقیم پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں دین حق کے قائم کر دینے میں لگا دے، وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے۔ ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن یہ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنے اس نصب العین اور مقصد حیات ہی میں کوئی ترمیم کر لے۔ یا اس کو ملتوی کر دے۔ یقیناً اس طرح کی کوئی بھی کارروائی اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے بغاوت کا، اور ملی خودکشی کا قدم ہو گا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہو گی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بہی خواہ رہنما چلا چلا کر اسے ادھر

جانے سے منع کر رہا اور صحیح راہ پر'' نے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر وہ ہو کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہنما کی باخبری، راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہو اور دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر محض اس لیے اصرار بھی کر رہا ہو کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے، جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند دکھائی دیتی ہے، جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بد قسمتی سے بحیثیت مجموعی آج یہ امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے، وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ بشرطیکہ یہ راہ اسے سہل اور ہموار اور دل کش دکھائی دیتی ہو چاہے وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم ہی تک کیوں نہ لے جاتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے، اور یہ صرف اس لیے کہ یہ راہ اس کو مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو دوسری تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں وہ جواب دیتی ہے کہ یہی ہمارا ایمان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ اس سے کس کافر کو انکار ہے؟ وہ کہتا ہے میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعوؤں کی بنیاد وہم و گمان اور اٹکل پچو پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب، وہ کہتا ہے میرے پاس اور صرف میرے پاس علم حقیقت ہے، میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، تمھاری اور ساری انسانیت کی نجات کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ ''بلاشبہ''، وہ کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے باطل ہے، جو کچھ میرے خلاف ہے سراسر جہل ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہم آہنگ نہیں، اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے کہ یقیناً لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک وصیت، ہے، اقامت دین کی

وصیت تو اس کی زبان جواب تک اس کے ہر دعوے کی تصدیق میں اتنی تیز تھی' معاً بند ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ان کا نفس حیلوں اور تاویلوں کا لشکر تیار کر کے سامنے آ جاتا ہے تا کہ اس اضطراب کو کچل ڈالے' جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہو چکا ہوتا ہے۔ مجرم انسان اگر اس کے اندر غیرت اور عزت نفس کی کوئی رمق باقی ہو' لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا، اگر اس غیرت اور عزت نفس کی حس میں احساس فرض کی حرارت بھی موجود ہوتی ہے تو وہ اسے مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرے اور اپنے عمل کے ذریعے اپنے دامن سے اس داغ کو دھو ڈالے اور اگر یہ صورت حال نہیں ہوتی اور اس کا سینہ اس حس اور اس احساس سے خالی ہوتا ہے تو پھر اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق وصواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اسے بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کی ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں برسر غلط قطعاً نہیں ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی محسوس کرا دے تا کہ اس کے داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔ ٹھیک یہی حال ہے اپنے فریضۂ ملی اور مقصد زندگی کی بجا آوری میں امت مسلمہ کا۔ وہ اپنے فرض کے چھوڑ بیٹھنے پر کچھ اسی قسم کے ادعائے بے گناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساس فرض کو بری طرح کچل کر رکھ دیا ہے اور ان بلند جذبات سے اس کا سینہ تقریباً اجڑ گیا ہے جو کسی نصب العین کی بجا آوری کے لیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ خصوصاً اقامت دین کے نصب العین کے لیے جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی' عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرط اول قدم ہے اس لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی کی کوشش کرتی اور اپنے منصب کو سنبھال لیتی' سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی۔ بلکہ طرح طرح کی دور از کار

تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس کو بھی دباتی جا رہی ہے۔ یہ تاویلیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور مختلف لوگ ادائے فرض کے مطالبے پر جواب میں مختلف معذرتیں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ یہی تاویلیں اور یہی معذرتیں دوسرے لفظوں میں فرار اور گریز کے یہی ''فلسفے'' امت کے ۹۹ فیصد سے زیادہ افراد کے لیے حجاب نظر بنے ہوئے ہیں اور جب تک ان کی بے حقیقتی واضح نہیں کر دی جاتی ان کا اپنے فرض کی طرف پلٹ آنا محال سا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کا جائزہ لیا جائے اور پھر ان پر تنقید کر کے بتا دیا جائے کہ فی الواقع ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟

گریز کے ''فلسفے''

جہاں تک عام جائزے کا تعلق ہے یہ تاویلیں یا گریز کے یہ ''فلسفے'' پانچ ہیں:

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ عمل کرنے والے کے لیے کسی حال میں بھی اپنی واقعی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو جانے کی راہ بند نہیں۔ چنانچہ جن کو اللہ تعالیٰ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی دین پر ٹھیک ٹھیک عامل ہیں۔ اپنے فریضے کو انجام دے رہے ہیں دین کی اقامت کر رہے ہیں، حق کی شہادت دے رہے ہیں اور امر بالمعروف کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن وسنت کے اس طرح کے اجتماعی احکام' جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے تو ان کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔ اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولوالامر ہیں، عوام نہیں ہیں۔ اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہے اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمے داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ احکام ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عام افراد سے ہے لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً غیر اسلامی عدالتوں سے معاملات کا فیصلہ نہ کرانا اور غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے نہ کرنا وغیرہ' تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں۔ اور یہ شریعت کا ایک عام اصول ہے کہ اضطرار کے وقت ناجائز کام بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصے کو چھوڑ بیٹھنے اور اقامت دین کا فریضہ بھول جانے کا عمومی الزام صحیح نہیں ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ ملت اسلامیہ کا مقصد وجود یہی اقامت دین ہی ہے لیکن موجودہ ناساز گار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے، لہٰذا اس وقت اس کی خاطر جدوجہد کرنا وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسے علانیہ پیش کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور ناعاقبت اندیشی کی دلیل ہی نہیں ہے بلکہ مفاد ملت کے لیے سراسر مضر اور مہلک بھی ہے۔ اس لیے سردست خدمت دین کی کچھ ایسی جزئی تدبیریں اختیار کی جانی چاہئیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربے سے دین کے احیاء میں مفید ثابت ہو چکی ہوں اور آگے چل کر ہمارے اس نصب العین کے لیے حالات کو نسبتاً کچھ زیادہ ساز گار بنا دینے والی ہوں۔ پھر جب یہ آج کے حالات بدل جائیں گے اور ہمارے اس مشن کے لیے وہ اتنے ناساز گار نہ رہ جائیں گے جتنے کہ اب ہیں' اس وقت اس کے لیے براہ راست جدوجہد شروع کی جائے گی۔

تیسرے گروہ کا انداز فکر یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے میں کوئی کلام نہیں' مگر اس کے لیے صدیقؓ اور فاروقؓ درکار ہیں' اور ہم ایسے بن نہیں سکتے' اس لیے ہمارے بس کا یہ کام ہی نہیں ہے جس مشن کو پیغمبرؐ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمانوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے، اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

چوتھا گروہ یوں سوچتا ہے کہ کام کی کوئی راہ کھلے اور کوئی قافلہ اس پر کامیاب گامزنی کا مظاہرہ کر لے تو ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہوں گے۔ گویا کسی جدوجہد کا شروع ہو جانا بھی ان کے لیے اقدام کو ضروری نہیں ٹھیرا سکتا، بلکہ یہ اقدام ان کے لیے صرف اس وقت ضروری ہوگا' جب کہ کچھ لوگ آگے چلنے والے انھیں نظر آجائیں اور وہ مضبوطی اور ثابت قدمی دکھا کر ایک حد تک راستے کو صاف بھی کر دیں' جب تک ایسا نہیں ہو جاتا ان کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو حضرت امام مہدی کے آنے کے منتظر بیٹھے ہیں۔

اس گروہ کو اگر چہ اس نصب العین کے برحق ہونے سے اختلاف نہیں مگر اس کے سوچنے کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اور انھی کی زیر سرکردگی یہ مہم چلائی جائے گی۔ ان کی آمد سے پہلے اس کام کی عام امت پر کوئی خاص ذمے داری ہے ہی نہیں۔ اس لیے ہم خواہ مخواہ یہ دردسر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گئے وہ لوگ جو دین کے قلادے کو اپنی گردن سے عملاً اتار کر پھینک چکے ہیں اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن وسنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں، تو ان کے خیالات سے تعرض کرنا فضول ہے کیونکہ وہ اس بات کے حق دار ہی نہیں کہ اس بحث میں ان کی باتوں کو بھی کوئی جگہ دی جائے بلکہ وہ شاید خود بھی اسے پسند نہ کریں۔

اب آیئے ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات کو دلائل کی میزان میں تول کر دیکھیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ آیا ان تاویلوں میں سے کوئی ایک تاویل بھی ایسی ہے جس سے واقعتاً ہماری ذمے داری اور مسؤلیت کچھ ہلکی ہو جاتی ہو۔

ا۔ دین کے جزوی اتباع پر اطمینان

پورے مجموعۂ شریعت کی پیروی کا وجوب

اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ قرآن وسنت میں صرف نماز، روزے اور حج و زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے صرف انھی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے، اسی طرح یہ کہنے کی بھی کوئی جسارت نہیں کرسکتا کہ عبادات اور اخلاق کے ماسوا جو احکام ہیں وہ (نعوذ باللہ) محض بھرتی کے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کتاب وسنت میں جو احکام ہیں وہ بندگی کا ایک جامع نظام اور زندگی کا ایک جامع ضابطہ ہیں اور ان کا ایک ایک جزو اتباع اور عمل ہی کے لیے ہے، آپ ان میں

علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض حکموں کو تو مانے اور بعض سے بے رُخی برت جائے۔ آقا کا حکم بہرحال حکم ہے، جسے ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ مسلمان نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب اگر (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے اس کے پاس یہ دو حکم آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز پڑھو۔ دوسرا یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ تو اس کا فرض ہے کہ وہ یکساں توجہ کے ساتھ ان دونوں حکموں پر عمل کرے، اس لیے کہ وہ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتا ہے اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتا ہے تو کون ہے جو اس کے اس طرز عمل کو اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام، قرآن کی پوری پابندی قرار دے سکے، پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام معطل ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی ہمیں خوش فہمی ہے کہ ہم اتباعِ دین کے مطالبے سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟

سیاسی اقتدار سے محرومی کا عذر

رہا یہ عذر کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف اور مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمے داری تو مسلمانوں کے اولوا الامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کے نافذ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس وقت یہ ذمے داری ہی ساقط ہے، تو یہ کھلا ہوا عذر گناہ ہے اور ایسا عذر گناہ ہے جو خود اس گناہ سے بھی بدتر ہے۔ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوا الامر! تم چور کا ہاتھ کاٹ دو یا یہ کہ اے اسلامی حکومت کے ذمے دارو! تم زانی کو کوڑے مارو۔ بلکہ اس طرح کے قوانین کا اور ان کے نفاذ کا جب وہ حکم دیتا ہے تو مخاطب پوری امت کو بناتا ہے مثلاً آیت سرقہ ہی کو لے لیجیے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا المائدہ 38:5

چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔

ان لفظوں کے اندر اگر چہ یہ صراحت نہیں ہے کہ خطاب اس حکم کا کن سے ہے؟ مگر دو وجوہ یہاں ایسے موجود ہیں جن کے باعث بنیادی طور پر اس حکم کا مخاطب اہل ایمان کا پورا گروہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ اصول کہ جب تک کسی حکم کے بارے میں یہ صراحت نہ ہو یا کوئی زبردست قرینہ نہ موجود ہو کہ یہ حکم فلاں خاص شخص یا خاص گروہ کے لیے ہے' اس وقت تک اس کو سارے اہل ایمان کے لیے عام سمجھا جائے گا۔ دوسری یہ بات کہ اس آیت سے تین آیتیں پہلے جو کچھ فرمایا گیا ہے اسے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا الخ کہہ کر' یعنی تمام اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ درمیان کی دو آیتوں میں کفار کے انجام بد کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہی یہ آیت سرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کے خطاب سے جو کچھ یہاں بیان فرمایا گیا ہے' ہاتھ کاٹنے کا یہ حکم بھی اسی کے اندر شامل ہے اور اس کا مخاطب نہ کوئی خاص فرد ہے نہ مسلمانوں کا کوئی خاص گروہ' بلکہ سارے مسلمان ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

يقول جل ثناءه من سرق من رجل او امرأة فاقطعوا ايها الناس يده..... فلا تفرطوا ايها المومنون فی اقامة حكمی علی السراق و غيرهم من اهل الجرائم الذين اوجبت عليهم حدودا فی الدنيا ۔

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو...... اے مسلمانو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر' جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۷، صفحہ ۱۴۳)

غور سے دیکھیے ایک جگہ فاقطعوا کے مخاطب حقیقی کی تصریح علامہ نے اَيُّهَا النَّاس کے لفظ سے کی ہے اور دوسری جگہ ايها المومنون کے لفظ سے یااولی الامر کہیں نہیں فرمایا۔ یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ مخاطبت کا یہ عموم صرف اسی آیت

سرقہ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام کے تمام تعزیراتی احکام کا حال یہی ہے اور ان سب میں بنیادی خطاب سارے اہل ایمان کی طرف ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان احکام کے نفاذ کی اصل ذمے داری پوری امت پر ہے' اس لیے یہ عذر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب اولوا الامر ہیں اس لیے امت کے عام افراد کی ان کے سلسلے میں کوئی مسؤلیت ہے ہی نہیں ایک واہی عذر ہے اور کسی طرح بھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

البتہ اس سلسلے میں ایک بات ضرور صحیح ہے' صرف صحیح ہی نہیں بلکہ قطعاً ضروری بھی ہے' اور وہ یہ کہ ان قوانین کا اجرا اولوا الامر ہی کے ذریعے ہوگا کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی چاہتا ہے ورنہ معاشرے میں افراتفری پھیل جائے گی اور کوئی اجتماعی نظام باقی ہی نہیں رہ سکے گا۔ حالانکہ اسلام سے بڑھ کر نظم و انضباط کا اور کوئی خواہاں نہیں۔

اب جب کہ دو باتیں اپنی اپنی جگہ ثابت شدہ اور مسلّم ہو چکیں۔ ایک تو یہ کہ اجتماعی احکام کی اصل مخاطب اور ذمے دار پوری امت ہے اور دوسری یہ کہ ان کا بالفعل نفاذ صرف اولوا الامر کرتے ہیں تو ان دونوں مسلّم باتوں کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ یہ اولوا الامر ان احکام کا اجرا و نفاذ پوری امت کی طرف سے اور اس کی نیابت میں کرتے ہیں نہ کہ اصل مخاطب اور ذمے دار کی حیثیت سے۔ اس حقیقت واقعی کے پیش نظر ایسی حالت میں' جب کہ یہ نیابت کرنے والے کسی وجہ سے موجود نہ ہوں یا موجود تو ہوں مگر وہ اپنا یہ فرض ادا نہ کر رہے ہوں تو اس ذمے داری کا رخ لازماً آپ سے آپ اصل مخاطب' یعنی پوری امت کی طرف ہو جائے گا اور اس کے لیے یہ ضروری ہو جائے گا کہ اگر اولوا الامر موجود نہ ہوں تو وہ ان کا تقرر کرے اور اگر موجود ہوتے ہوئے وہ ان احکام کو نافذ نہ کر رہے ہوں تو وہ انھیں اس کے لیے مجبور کرے' یا انھیں ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ پر لائے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے۔ اگر اولوا الامر کے گروہ نے ان کی تعمیل کر دی تو پوری امت کے سر سے یہ فرض اتر جاتا ہے بصورت دیگر یہ ایک اجتماعی گناہ ہوگا جس کا وبال پوری امت پر رہے گا۔

یہاں پہنچ کر ایک اور سوال بھی کیا جائے گا اور وہ یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے اور جس کی موجودگی ہی میں امت اپنے اندر سے اولواالامر کا تقرر کر سکتی ہے اور پھر ان کے ذریعے اپنے اس فریضے سے عہدہ بر آ ہو سکتی ہے؟ یقیناً یہ ایک سنجیدہ سوال ہے اور اس بات سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ ایسے احکام کے نفاذ کی اصل ذمے دار اور مخاطب اگرچہ پوری جماعت ہے مگر عملاً ان کا نفاذ ایک قوت قاہرہ یعنی اقتدار حکومت ہی کی موجودگی میں ہوگا۔ اس اقتدار کے بغیر ان احکام کا جاری کرنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اس کام کے لیے، یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصے پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے لیکن اس سوال کے سلسلے میں سوچنے کی بات کیا ہے؟ آیا یہ کہ سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمے داریوں میں کمی آ جاتی ہے؟ یا یہ کہ وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا شکر ادا کر کے اس بات پر اطمینان کا سانس لینا چاہیے کہ چلو قرآن کے ایک حصے پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی؟ یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف یہ کہ سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور کتاب الٰہی کو چھوڑ بیٹھنے اور بھول جانے کی قدیم سنت ضلال دہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل وقال سے پاک کر کے، کان اپنے قلب وضمیر کی آواز پر لگا لیجیے اور سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہوگی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا، اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے موجود ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرائے تو اس کے موجود نہ ہونے کی صورت میں اس پر دو فرض عائد ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ پہلے وہ اس قوت کو حاصل کرے۔ دوسرا یہ کہ قوت حاصل

ہو چکنے پر ان احکام کو نافذ کرائے' کیونکہ یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ جس چیز پر کسی فرض کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے اس کا حاصل کرنا خود فرض ہو جاتا ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جانماز ناپاک ہے اور اس پر یہی الزام لگائیں گے کہ یہ اپنے فرض سے جی چرا رہا ہے' اس کے دل میں نماز کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ محبت' ورنہ ایسا عذر لنگ نہ کرتا۔ اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش میں یا جانماز پاک کرنے کی تدبیر میں لگ جاتا۔ پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان آج قرآنی احکام کے ایک بڑے حصے کو معطل کر کے صرف اس لیے مطمئن بنا بیٹھا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے لیے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ میسر نہیں اور اس جھوٹے اطمینان پر اس کی مومنانہ حس کو ذرا ٹھیس نہیں لگتی۔ اور نہ اس کے تقویٰ پر اس کی نگاہِ احتساب کوئی حرف رکھتی' نہ اسے اپنا یہ عذر' عذر لنگ معلوم ہوتا ہے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ اگر یہ اقتدار اسے میسر نہیں تو یہ اس کا اولین فرض ہے کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اسے حاصل کرے۔

بلاشبہ یہ ایک بڑا دشوار کام ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے ساری طاقت نچوڑ نہ دی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مومن کی طاقت خواہ وہ ذہنی اور دماغی ہو' خواہ جسمانی' مالی ہو خواہ جانی' ہے کس کام کے لیے؟ آخر اس کے دل و دماغ کی قوتیں اور اس کی جان و مال اس کی اپنی ملکیت تو ہیں نہیں کہ انہیں سینت کر رکھے رہے' بلکہ جس روز اس نے ایمان کا اقرار کیا تھا اسی روز یہ چیزیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ' اس کی رضا کے عوض بیچ چکا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَاَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ ؕ التوبہ 9:111

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔

اس خرید و فروخت کے ہو جانے کے بعد ان چیزوں کی حیثیت اب اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے طور پر رکھی ہوئی ہیں۔ ''امانت'' کے بارے میں یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ جب بھی اس کا مالک اسے طلب

کرے بے چون و چرا اس کے حوالے کر دینا امانت دار کا فرض ہے' اس لیے جب تک کوئی مومن اپنے مومن ہونے سے انکار نہیں کرتا اس کا یہ فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پاس رکھی ہوئی اپنی امانت جب اور جس طرح طلب کرے وہ اسی وقت اور اسی طرح اسے لا کر حاضر کر دے' یہ بات کہ اپنی یہ امانت اس نے اپنے مومن بندے کے پاس کس لیے رکھ چھوڑی ہے؟ اس کی کتاب ہی بتا سکتی ہے، یہ کتاب کہتی ہے کہ:

وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ التوبہ 9:41

اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

بات بالکل واضح ہو گئی' یعنی یہ کہ وہ چیز' جس پر مومن کی جان و مال خرچ ہونے کے لیے ہے وہ ''اللہ کی راہ'' دوسرے لفظوں میں اس کا دین ہے، اس لیے وہ اپنے فرض بندگی سے سبکدوش اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی شکل میں کہ ان چیزوں کو ''اللہ کی راہ'' میں نثار کرنے سے دریغ نہ کرے۔ ورنہ جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور ہمارے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اسے عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا کوئی معمولی جرم نہ ہوگا' بلکہ بدترین قسم کی خیانت اور کمینہ پن ہوگا اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعے اس مانع کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے۔ لیکن اس کا حال یہ ہو کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انھیں دور کرے' کرتا یہ ہے کہ موانع کا عذر کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور پھر اطمینان کے ساتھ ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگائے رکھتا ہے۔

اضطرار کا عذر

یہ عذر لنگ تو ان احکام کے سلسلے میں تھا جن پر غیر اسلامی اقتدار بالا کی موجودگی میں عمل فی الواقع نہیں ہو سکتا۔ اب رہ گئے بعض وہ احکام دین جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی انھیں چھوڑ رکھا گیا ہے' تو ان کے سلسلے میں یہ عذر پیش کیا

جاتا ہے کہ ایسا اضطراراً ہو رہا ہے' اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی جائز ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ عذر بھی پہلے عذر ہی جیسا بے وزن عذر ہے اور یہ کہ اس طرح کی بات یا تو اپنی عام اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعے کی بنا پر کہی جا سکتی ہے یا پھر رخصت اضطرار کی ضروری حدود اور شرائط سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ چنانچہ آیئے جس قانونِ اضطرار کی آڑ لی جاتی ہے' اس کے الفاظ دیکھیے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ البقرہ 173:2

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) اس حال میں کہ (اس حرام شے کے کھانے کی) نہ تو وہ کوئی رغبت رکھتا ہو اور نہ (ناگزیر مقدار سے) تجاوز کرتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ الفاظ ایک حرام شے کے استعمال کی رخصت دیتے ہیں مگر آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رخصت بلا قید و شرط نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس کے لیے تین تین شرطیں بھی عائد کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان میں سے ایک ایک شرط کا پورا ہونا ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان میں سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ حالت واقعی مجبوری کی ہو اور کسب حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بے کار ہو چکی ہوں کہ بس لقمۂ حرام کے سوا اب جان بچانے کا کوئی ممکن ذریعہ باقی ہی نہ رہ گیا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال غَيْرَ بَاغٍ ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ اس کا استعمال کیا جائے تو پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ کراہت کے ساتھ کیا جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حرام کا یہ استعمال بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک کہ جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔

اگر ان تینوں شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک ناجائز شے کا استعمال کرے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری ہونے

سے رہ گئی تو پھر اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور اگر اس شکل میں بھی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو یہ اس کی کھلی ہوئی دھاندلی ہوگی اور اسے اللہ تعالیٰ کے حضور اس کا خمیازہ لازماً بھگتنا پڑے گا۔

اسلامی قانون اضطرار کی وضاحت آپ کے سامنے آ چکی۔ اب اس کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرزِ عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتائیے جو اقتدار باطل کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے ''مسرفین'' کی اطاعت کرنے' لادین اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز بننے' غیر اسلامی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانے اور طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری' وہی ناگواری اور وہی کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کی سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہوسکتی ہے۔ کیا کروڑوں انسانوں کا یہ بھاری انبوہ غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ گروہ' جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب اپنے اس فعل کو اصلاً حرام ہی سمجھتے اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں؟ اور ان میں اپنی اغراضِ نفس کی پیروی حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکامِ شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ کارفرما نہیں ہوتا؟ کیا وہاں وہ فی الواقع صرف اس لیے جاتے ہیں کہ انھیں اپنی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ کیا یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں غیر اسلامی آئین و قانون کے مطابق دادِ انصاف دینے میں گزار دیتے ہیں درحقیقت ''مخمصہ'' (فقر و فاقہ) ہی کے شکار ہوتے ہیں اور اپنی اسی مجبوری کی بنا پر اپنے اس مشغلے کو گوارا کرتے ہیں؟ کیا جس وقت وہ اللہ جل مجدہ' کے قوانین پس پشت ڈال کر خدا ناشناس انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس وقت ان کا دل اپنے اس فعل کی برائی کا کوئی احساس رکھتا ہوتا ہے اور اپنی اس حالت پر کڑھ رہا ہوتا ہے؟ کیا وہ یہ کام بالکل غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو کر انجام دیتے ہیں؟ اگر ان

سوالوں کا جواب نفی میں نہیں ہے تو یقینا یہ سب لوگ فَلَا اِثْمَ عَلَیْهِ کی رخصت اور رعایت کے مستحق ہیں۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فیصدی بھی موافقت نہیں کرتے، اگر خود احتسابی کی جرأت سے کام لے کر حقیقت حال کا جائزہ لیجیے تو مشاہدہ آپ کو یہ ماننے پر مجبور کردے گا کہ ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرط اضطرار کی ضرورت کا عموماً تصور تک نہیں پیدا ہوتا۔ ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو فقر و فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہو اور جس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار رہ ہی نہ گیا ہو کہ بقائے حیات کی خاطر یہ رزقِ خبیث قبول کرلے۔ ان جگہوں تک تو پہنچ ہی وہ لوگ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوتے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ اس انتہائی قسم کے افلاس میں مبتلا نہیں ہوتے جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے شوق اور رغبت کے ساتھ کیا جارہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ جائیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقی درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے حالانکہ اگر واقعتاً اضطراری حالت ہی کی وجہ سے کوئی یہ ذریعہ معاش اختیار کیے ہوتا تو اس کے اطمینان کا فطری تقاضا یہ تھا کہ اس پر ہرگز مطمئن نہ ہوتا۔ اور اسے چھوڑ کر کوئی جائز ذریعۂ معاش پا لینے کے لیے بے چین رہتا۔ مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کے دل سے منکر ہوتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو ہم یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل وقال اور حجروں کی ہائے ہُو میں سکون کے ساتھ مشغول نہ رہتے' اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو کرتے ہی کہ اس ''منکرِ اعظم'' کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کرتے اور نہ اس کے سلسلے میں کسی اعتقادی اور قولی مداہنت کے روادار ہوتے۔ اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ ہم اپنی زبان کی پوری قوت سے اس کی کھلی مخالفت کرتے اور اگر یہ بھی نہ ہوسکتا تو اس سے دلی

نفرت تو بہر حال رکھتے ہی۔ کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ ایمان کی آخری حد ہے۔ آپؐ برائیوں اور برے لوگوں کے سلسلے میں اہلِ ایمان کا رویہ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

مَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ لَيْسَ وَرَاءَ ذَالِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ

(مسلم۔ جلد اول)

جس نے ان سے اپنے ہاتھ کے ذریعے جہاد کیا وہ مومن ہے، جس نے اپنی زبان کے ذریعے جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے جس نے اپنے دل کے ذریعہ جہاد کیا وہ (بھی) مومن ہے، اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان (متصور) نہیں۔

مگر یہاں حال یہ ہے کہ اتنی بڑی برائی سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت کا سوال تو الگ رہا۔ اسے برا سمجھنا بھی چھوڑ دیا گیا ہے حتیٰ کہ اب اس کے قیام کے لیے حلفِ وفاداری اٹھا لینے میں بھی کوئی مضائقہ باقی نہیں رہ گیا ہے اور اس کی بقا کے لیے علانیہ جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جارہی ہیں۔ کیا ایک قابل نفرت شے سے یہی برتاؤ کیا جانا چاہیے؟ ایسی کھلی ہوئی برائیوں کے بارے میں بھی اگر ایمان کے اس کم سے کم تقاضے کا اظہار نہ ہوسکا جس کی حدیث مذکور میں وضاحت کی گئی ہے تو پھر ایسے ایمان کو زندہ ایمان کیسے کہا جاسکتا ہے؟ آخر اضطرار کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہیے۔ اگر اس کے دامن کو اتنی وسعت دے دی جائے، جتنی کہ ہمارے عام رویے سے ظاہر ہو رہی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتی۔ ایسی حالت میں تو ایک ''مسلمان'' اپنے نفس کی پیروی اسی آزادی سے کرتا رہے گا، جس آزادی سے خدا کے منکر کیا کرتے ہیں اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار رہ جائیں گے جن کی تعلیم کے لیے قرآن کو اتارا اور صاحبِ قرآنؐ کو بھیجا گیا تھا لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اضطرار کا یہ وہ من مانا مفہوم ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور رسولؐ بالکل بری ہیں۔

ہم اس پستی تک جس طرح پہنچے ہیں اسے بھی سمجھ لینا چاہیے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ایک

برائی کسی سوسائٹی میں پہلے نمودار ہوتی ہے تو سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار ضرور کرتا ہے لیکن اس نفرت اور ملامت کا جذبہ قوی اور عام ہوتا ہے تب وہ برائی دب جاتی ہے، ورنہ وہ جڑیں پکڑنے لگتی اور آہستہ آہستہ برگ و بار لانے لگتی ہے۔ اب اگر اس سوسائٹی کے خیر پسند لوگ بھی اپنے امکان بھر اس کی جڑیں اکھیڑنے کی کوشش میں برابر لگے نہ رہیں اور اس کے خلاف صرف رسمی اظہارِ خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھ لیں تو رفتہ رفتہ ان کے اندر سے بھی اس کی نفرت کا احساس مدھم ہوتا چلا جاتا ہے اور زیادہ دن نہیں گزرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام کم و بیش سبھی اس کے رنگ میں رنگے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ معاشرے کی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے اپنی اصولی اخلاقیات تک میں رد و بدل ناگوار نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک مسلمہ نفسیاتی حقیقت ہے اور سوسائٹی میں برائیوں کا پھیلاؤ ہمیشہ اسی انداز پر ہوتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کی گئی تھی کہ:

وَاللهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔الخ (الحدیث)

بخدا تم معروف کا حکم ضرور ہی کرتے رہنا اور منکر سے ضرور روکتے رہنا ......الخ

وہیں اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا تھا کہ:

اولیضرِ بن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض۔ (ابوداؤد بحوالہ ریاض الصالحین)

ورنہ اللہ تعالیٰ تم سب کے دلوں کو ایک جیسا (منکر پسند) بنادے گا۔

لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس ہدایت اور اس تنبیہہ کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ برائیوں میں غرق ہو جانے کے مذکورہ بالا نفسیاتی اصول نے انھیں پوری طرح اپنی زد میں لے لیا۔ جس وقت فکری گمراہیوں اور عملی خرابیوں نے ان کے اندر گھسنے کی کوشش کی انھوں نے ان کی مسلسل مزاحمت نہیں کی۔ اور آہستہ آہستہ ان سے مانوس ہوتے گئے۔ پھر جب اسی حالت پر صدیاں گزر گئیں تو اب وہ صورت پیدا ہو چکی ہے جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یعنی عام مسلمانوں کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے اندازِ فکر سبھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ جس چیز سے نفرت ہونی

چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے۔ جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا' وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبرؐ نے انھیں ایمان کی آخری حد یہ بتلائی تھی کہ برائی کوئی بھی ہو اس سے دل میں نفرت رکھی جائے' ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا ڈالنے کے لیے برابر اُبھارتی رہے۔ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی برائی کا پسند کرنا ہی ایمان کے منافی نہیں قرار دیا تھا بلکہ اسے دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت نہ پانے کو بھی ایمان کی موت کی یقینی علامت ٹھیرایا تھا۔ مگر اب آپؐ کے پیروؤں کو اس امر پر اصرار سا ہے کہ ہم کسی کراہت اور احساس نفرت کے بغیر انسانی حاکمیتوں کو سلامیاں دیں گے۔ ان کی اطاعتوں کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے۔ ان لوگوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرائیں گے جنھوں نے اپنی ''عدالت گاہوں'' میں خدا کا ''داخلہ'' بند کر رکھا ہے بلکہ خود بھی انھی کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے کریں گے اور اگر موقع ملا تو خود اپنی بھی حاکمیت کا پھریرا لہرا دیں گے۔ اپنی آزاد مرضی سے قانون سازیاں کریں گے، جس چیز کو چاہیں گے جائز اور جس چیز کو چاہیں گے ناجائز ٹھیرائیں گے اور پھر نہ ہمارا دین جائے گا نہ ہمارا ایمان خراب ہوگا۔ نہ ہماری توحید متاثر ہوگی۔ نہ ہماری عبودیت پر حرف آئے گا' نہ ہمارا اتباع رسولؐ کا دعویٰ غلط ٹھیرے گا' نہ ہم پر کتاب الٰہی کے چھوڑ بیٹھنے کا الزام عائد ہوگا اور نہ ہم اپنے اللہ سے عہد شکنی کے مجرم ہوں گے، کیوں؟ اس لیے کہ ہم حالتِ اضطرار میں ہیں۔

اسے فریب نظر کہیے یا فریب نفس' بہرحال اس میں ذرا شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی مہلک اور خطرناک فریب ہے۔ اس کی خطرناکیوں اور ہلاکتوں کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ اس کے ان دور رس نتائج کا قدرے تفصیلی جائزہ لے لیں جو ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے

اسلام کی ایک بنیادی تعلیم کی خلاف ورزی کی، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اب ہماری پوری زندگی، شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ سانچے سے بالکل مختلف ہوگا۔ اب ہمارے معاشرے کی تاسیس، ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی تربیت اور ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی۔

غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جانے دی گئی جو ہماری زندگی کے ایک دو نہیں بلکہ بے شمار معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیا اور اس کے صرف اتنے حصے پر اکتفا کر لیا جس کا تعلق بس چند مخصوص مذہبی رسوم اور عبادات سے ہے۔

یہ محض عالم قیاس کی باتیں نہیں ہیں بلکہ واقعات اور حقائق ہیں جنھیں ہر وہ شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے جس نے اپنے دینی احساس کو کند نہ بنا لیا ہو۔ ملت کے علم برداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو اقتدار کے حاصل نہ ہونے کا عذر کر کے اور اولوالامر کو اس کا بنیادی مخاطب قرار دے کر، اور پھر اضطرار کی آڑ لے کر زمانہ سازی کی جو روش اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ قرآن کے کتنے ہی احکام اور اصول سے ان کا علمی رشتہ کٹ کر رہ گیا ہے اور دین کے صرف ایک محدود حصے ہی پر وہ عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ ابتدا میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے ان اہم تقاضوں سے اس جبری علیحدگی پر ایمانی خودی مضطرب تو ضرور ہوئی، مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اضطراب سکون و اطمینان سے بدلتا گیا اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ دین صرف انھی چند عبادات اور مذہبی رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جن کو لوگ عموماً ادا کر لیا کرتے ہیں اور ان

کے علاوہ جو کچھ ہے دین سے اس کا تعلق، غیر محسوس طور پر بس برائے بیت ہی خیال کر لیا گیا ہے۔ اگر فکر و نظر کے زاویے ایسے نہ بن گئے ہوتے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ان اجزائے دین پر اگر عمل نہیں ہو رہا تھا تو اسی کے ساتھ ان کی نظری اہمیت بھی گھٹ جاتی؟ اور اس حد تک گھٹ جاتی کہ دل ان کے لیے کسی اضطراب، کسی تمنا اور کسی حسرت سے بھی محروم ہو جاتے؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ مگر اللہ کے بے شمار احکام کی مظلومیت پر بہانے کے لیے ان کے پاس چند قطرے آنسو بھی نہیں ہوتے۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تو دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ کچھ دنیا کا۔ لیکن چونکہ یہ احکام بھی اسی قرآن میں موجود ہیں، جس میں ان چند مخصوص عبادات اور رسوم کا ذکر ہے اور ہر اس حکم کے اتباع کا قول دیا گیا ہے جو قرآن و سنت میں ہو، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ احکام دین سے غیر متعلق ہیں مگر جب ان پر عمل کرنے کا اور ان کے سلسلے میں دیے ہوئے قول کو پورا کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی ان احکام کا اصل مخاطب بننے ہی سے انکار کرا دیتا ہے اور کبھی رخصتِ اضطرار کی ڈھال ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔

غرض حقیقت حال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی کے غلبے نے کافرانہ اقتدار اور باطل اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈالنے پر آمادہ کیا۔ پھر اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصے کو عمل و اتباع کی حدود سے خارج کر دینے پر مجبور کر دیا۔ بعد ازاں اس مجبوری نے خدا پرستی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطا کار صورت چھپائے رکھنے کے لیے دین کے تصور ہی کو محدود اور بے روح بنا کر رکھ دیا۔ ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے نظری طور پر بھی وہ ہماری آزادروی پر کبھی انگلی تک نہ اٹھا سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی اس عظیم معصیت اور بے عملی کے اس احساس کو بھی سُلا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار

سے محرومی اور اضطرار کے حیلے آئے، اور انھوں نے آ کر ان تمام رخنوں کو ڈھک لیا جو ہزار کوششوں کے باوجود ان نظریات کے اندر دکھائی پڑ ہی جاتے تھے۔ اور اب یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہی ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں اور خوش فہمیوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے اندر غور و فکر کی قوتیں صید زبوں بن کر رہ گئی ہیں۔ نتیجہ اس پوری صورت حال کا یہ ہے کہ مسلمان پر حقیقت بینی کی راہ بند سی ہو گئی ہے اور اس میں تلاش منزل کی امنگیں بھی دم توڑتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب سے بڑی بدقسمتی ہے جس میں کوئی مسلمان مبتلا ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تب تو یہ امید ضرور کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کر لے گا۔ لیکن اگر یہ احساس ہی مردہ ہو گیا۔ اور اس کی نظر میں غلطی غلطی ہی نہ رہ گئی تو پھر اس کے اصلاح پذیر ہونے کی کوئی توقع باقی نہیں رہ جاتی۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے جلد از جلد باز آ جائے اور اتباع دین کے معاملے میں جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوتی چلی آ رہی ہیں ان کو سیدھی طرح تسلیم کر کے اس کی تلافی کی کوشش کرے۔

نگاہِ مسلم کی بے بصیرتی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت بخشی کا معاملہ بھی عجیب شان رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے۔ مگر وہی چیز دوسروں کے لیے ضلالت کا پیام بن جاتی ہے۔ اور وہ اس کے باعث راہ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس قانون عدل پر ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اس کے سامنے اس کی راہ کھولی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے اس کے سامنے اس کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ سورج کی کرنیں بینائی والوں کے لیے پوری دنیا کو روشن کر دیتی ہیں۔ مگر الوؤں اور چمگادڑوں کی نگاہیں اپنے جبلی نقص کی بنا پر ان کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا پاتیں۔ چنانچہ قرآن نے اپنی

صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں۔ وہیں یہ بھی کہا ہے کہ میں بہتوں کے لئے گمراہی کا ذریعہ بھی ہوں (یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّیَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ) (البقرہ26:2)اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ راہ راست اُسی شخص کو دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی اس کی حقیقی آرزو ہو۔ لیکن جو اپنی آنکھیں بند ہی رکھتا ہے اسے زبردستی دھکیل کر اس راہ پر ڈال نہیں دیا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ اس بے اعتنائی کے ردعمل میں وہ اس سے کچھ اور دور جا پڑتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ قانون صرف کفار ہی کے لیے ہے' اور مومن چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں اس لیے اب وہ قانون کے دائرہ نفاذ سے باہر ہیں۔ نہیں' بلکہ یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود زندگی کے مختلف معاملات میں اس سے کسب ہدایت اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص کے ساتھ اس کی خواہش اور کوشش بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی اور زندگی کے جن معاملات میں بھی' اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی' اور غیر مشروط طور پر اس کی پیروی کرنے کی اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی' تو یقیناً وہ اس کو گمراہیوں کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا اور اس بات کا لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں' بلکہ میرا ماننے والا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت پا لینے کے بعد بھی اپنے قلب ونظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے' اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا! میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے: رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ہَدَیۡتَنَا۔ (آل عمران 8:3)

قرآن کے ان احکام کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں دراصل یہی قانون ہدایت کام کر رہا ہے۔ چونکہ ان کے سلسلے میں امر حق معلوم کرنے کی سچی خواہش باقی نہیں رہی اس لیے نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکل سکتا تھا کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن وسنت میں جو اس انداز خطاب کے

ساتھ احکام آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو اسی راہ راست کی طرف بلاتے رہو' اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ و فساد کا سر کچل دو' اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو۔ اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو' اے اہل ایمان! زانی کو درے لگاؤ' وغیر ذالک .... تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم امر حق کی سچی طلب لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک صاحب اقتدار پارٹی سے کم کی ہے ہی نہیں۔ وہ اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جُوئے تلے نہیں' بلکہ امامت و جہانبانی کے تخت پر بتا رہا ہے اور اس مقام سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا' نہ اس سے نیچی سطح پر وہ کبھی اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی' ملّی زندگی کا کتنا بلند تصور تھا جو اس اسلوب بیان کے پیچھے موجود ہے اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا پیام تھا جو یہ اشارۂ قرآنی دے رہا ہے؟ مگر قصور نظر کا برا ہو۔ اس چشمۂ حیوان کو بھی ہم نے اپنے لیے بحر ہلاکت بنا لیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزت کے اس طرز خطاب کی حکمت کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کر لیا جاتا' اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی کوشش کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جدوجہد میں لگ جایا جاتا جہاں ہمارا آقا ہم کو دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں پہنچے بغیر ہم اس کے بہت سے احکام کی تعمیل اور اس کی پوری رضامندی کی تحصیل کر ہی نہیں سکتے۔ مگر افسوس کہ یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ یہ کہہ کر ان احکام کے مخاطب تو حکام اور اولوا الامر ہیں ہم نے اپنی ذمے داری کا بوجھ ہی اتار کر پھینک دیا۔

بالکل اسی انداز سے آیت اضطرار پر بھی نظر ڈالی گئی۔ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرطوں میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز چھپا ہوا تھا' اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے

ایمانی ذوق کی بلندی برقرار رکھنے کا ان میں جو مطالبہ موجود تھا اس کی طرف نظریں گئی ہی نہیں یا گئی ہوئی نظریں پھیر لی گئیں اور فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ پر انھیں لا کر اس طرح جما دیا گیا کہ پھر دین کی پیروی میں نہ کسی قربانی کا سوال باقی رہ گیا نہ وہ نفس پر کچھ ایسی گراں رہ گئی۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالت مجبوری حرام سے استفادے کی رخصت عطا کی گئی ہے لیکن یہ آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے، ضروری ہے کہ وہ بھی نگاہ میں رہے۔ آیت کے اس دوسرے پہلو کی ترجمانی غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے الفاظ کرتے ہیں، ان لفظوں میں حرام سے استفادہ پر جو شرطیں لگائی گئی ہیں ان کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمان اگر کسی حرام سے استفادہ کرنے پر مجبور ہو جائے تو چاہئے کہ اسے استعمال کرتے وقت اپنے اندر اس کی کوئی رغبت محسوس نہ کرے اور نہ بالکل ناگزیر مقدار سے زیادہ اسے استعمال کرے بلکہ ان کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس حالت سے نکلنے اور اس استعمالِ حرام سے نجات پا جانے کی اسے گہری فکر اور بے تابانہ کوشش کرنی چاہئے' بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی شخص کا پاؤں اگر نکیلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر اسے جلد از جلد اٹھا لینا چاہتا ہے، جب تک اس حالت سے نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھتا رہے کہ مردار کا سڑا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں۔ یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں' یا سڑاند بھری غلاظت ہے جس سے جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آیت کا یہ پہلو بھی اگر ہماری نظروں میں ہوتا اور اس کے بتائے ہوئے اس ایمانی ذوق کے اگر ہم قدر شناس ہوتے تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت' وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرزِ فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت اضطرار کے نام پر صدیوں تک باطل کے ساتھ اس طرح کی قابلِ شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباعِ قرآن کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ زندگی کی غیر اسلامی راہوں پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے اور نہ تو اس کا ضمیر کبھی اسے جھٹکا دیتا ہے نہ اس کی ایمانی غیرت کبھی اس کا دامن

پکڑتی ہے۔ اس کے بخلاف ہوتا یہ کہ باطل افکار‘ غلط نظریات اور غیر اسلامی نظامہائے حیات کے خلاف ہم مجسم احتجاج ہوتے۔ ہمارا ایمانی مزاج ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری اسلامی حس ہمیں مجبور کر دیتی کہ اس گندگی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنے دامن سے دھو کر دم لیں، لیکن افسوس ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرطیں اور ان شرطوں کے تقاضے سب فراموش ہو گئے۔

امید ہے ان بحثوں کے بعد یہ اب کوئی مشکوک حقیقت نہ رہ گئی ہوگی کہ دین کے جزوی اتباع پر مطمئن رہنا اور اسے اپنے ایمانی فرائض سے عہدہ برآ ہو سکنے کے لیے کافی سمجھ بیٹھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی‘ بلکہ نافہمی ہے جسے افسوس ناک بھی کہنا چاہیے اور خطرناک بھی۔ ایسا سمجھنا دراصل ایمان کے بے جان ہو جانے کی دلیل ہے یا پھر دین کی بصیرت سے محروم ہو جانے کا ثبوت۔ یہ فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب ملت کی وہ کمزور دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جایا کرتی ہیں۔

۲۔ ناسازگار حالات کا عذر

اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین اور اس واحد فریضۂ حیات کی بجا آوری سے اس لیے کترا رہا ہے‘ اور دوسروں کو بھی کترا کر چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حالات اس کام کے لیے کسی طرح سازگار نہیں اور ان کے اندر اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ پھر حالات کے اس مطالعے کا تقاضا وہ یہ بتاتا ہے کہ فی الحال اس کام کا نام بھی نہ لیا جائے اور اس کے بجائے اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر سمیٹ دی جائیں جہاں سے ہم حالات کی رفتار پر اس طرح اثر انداز ہو سکیں کہ مستقبل کی فضا اس کام کے لیے اتنی تاریک نہ رہ جائے یہاں تک کہ ایک وقت چل کر ہم اپنی اس حقیقی منزل مقصود کی طرف علانیہ مارچ کر سکیں۔

چند تنقیحی سوالات

اس نظریے پر غور کیجیے تو قدرتاً ذہن میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ کیا اس فریضے کی ادائیگی کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے میں حالات کی ناسازگاری اور اس جدوجہد کی کامیابی کے امکان وعدمِ امکان کی بحث پیدا بھی ہوسکتی ہے؟

۲۔ کیا آج کے حالات میں دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

۳۔ ناسازگاریٔ حالات کی بنا پر اس منزل کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ، یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

ان سوالوں کا صحیح جواب جب تک معلوم نہ ہوجائے اس نظریے کا حق یا ناحق ہونا بھی معلوم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے ان کے واضح جوابات حاصل کیے جائیں۔

اللہ کی کتاب سے، اس لیے کہ اسی نے اپنے پیروؤں پر یہ بارِ عظیم ڈالا ہے، اور ساتھ ہی اس کا یہ دعویٰ ہے، جس کی صداقت کا کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا کہ وہ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ دوسرے تمام امور میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اسی مسئلے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو جو سارے مسائل سے زیادہ اہم تھا اور جو تمام فرائض دینی کا صدرنشین ہے۔

اللہ کے رسولوں کے طریق کار اور اسوۂ اعمال سے، اس لیے کہ ان پاکانِ خاص اور ان کے سچے پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف ہی نہیں جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

امکان کی بحث سے ادائے فرض کی بے نیازی

پہلے سوال کا جواب اللہ کی کتاب یہ دیتی ہے کہ مومن کے لیے اپنے اصل فریضے اور مقصدِ وجود کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ضروری ہے اور اسے چاہیے کہ انجام کی پروا کیے بغیر اس میں ہر وقت لگا رہے۔ اسی طرح انبیائے کرام کا اُسوہ بھی ٹھیک اسی بات کی گواہی

دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے کہ جو نبی بھی دنیا میں آیا اسے لوگوں کے سامنے آتے ہی یہ مطالبہ رکھ دینے کا حکم تھا کہ:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ النحل 36:16

لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی پیروی سے بچو۔

......اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ الانبیاء 25:21

.... بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا میری بندگی کرو۔

یہ چند حرفی مطالبہ دراصل اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی تعارف ہے جس کو اقامت دین کہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت ''عبادت''، ''الٰہ'' اور ''طاغوت'' کے جن محدود مفہوموں سے عام ذہن آشنا ہیں ان کی بنا پر اس بات میں کچھ غلو محسوس ہو، لیکن قرآن مجید نے شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا ..... اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ الشوریٰ 13:42 فرما کر اس خیال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی ہے کیونکہ اس کے ان لفظوں سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو رہی ہے کہ نوحؑ ہوں یا ابراہیمؑ، موسیٰؑ ہوں یا عیسیٰؑ محمدؐ ہوں یا کوئی اور پیغمبر بلا استثناء ہر نبی کو اللہ کے نازل کئے ہوئے دین کی دعوت و اقامت ہی کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اس لیے فَاعْبُدُوا اللّٰہَ کا پورا اور صحیح مفہوم اس مفہوم کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جو اقیموا الدین کا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ ان حضرات نے اپنے اس فریضے کو کس طرح ادا کیا؟ تو اس کے جواب میں کیا یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جس مشن اور مقصد کو لے کر یہ اصحاب عزیمت تشریف لاتے رہے ہیں اس کے اظہار و اعلان میں یا اس کی جدوجہد میں انھوں نے ایک لمحے کی بھی دیر لگائی ہوگی؟ یا یہ کہ حالات کی سازگاریوں کا جائزہ لیا ہوگا یا یہ کہ امکان و عدم امکان کی بحثوں میں الجھے ہوں گے۔ اور جب اس جائزے اور بحث سے کامیابی کے روشن امکانات سامنے آ گئے ہوں گے تب جا کر انھوں نے اپنی کشتیوں میں بادبان لگائے ہوں گے؟ ہو سکتا ہے کہ عقلِ مصلحت اندیش کا فتویٰ اس بارے میں کچھ اور ہو، مگر قرآن کا کہنا تو یہی ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ اس کے بخلاف ہر نبی نے اپنے اس فرض

منصبی کی ادائیگی اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس مہم کے کامیاب ہو جانے کی اس نے خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کا انجام سوچنے میں ضائع کیا۔ نہ اس کے امکان اور عدمِ امکان کا اس کے ذہن نے سوال اٹھایا' نہ حالات کی کوئی سازگاری ایک دن کے لیے اس سے اس آواز کو سینے میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی۔ بلکہ وہ اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس فرض کو مسلسل بجالاتا رہا۔ ان میں اگر کچھ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق کامیاب ہوگئی اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر کے دین اللہ کو غالب اور نافذ فرما گئے تو بے شمار ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے لیل و نہار' اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے، مگر اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا انجام زیادہ تر صرف ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے ان کی ''قوم'' رات دن انھیں نوازتی رہتی تھی اور جب وہ اپنا فرض بجالا کر دنیا سے رخصت ہونے لگے تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔

ابراہیم علیہ السلام بڑھاپے کی عمر تک بندگیِ رب کا پیغام سناتے پھرے اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کی لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی میں انھیں جیسی جیسی ابتلاؤں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑا وہ شاید ہی اپنی نظیر رکھتی ہوں گی لیکن اس ساری تگ ودو اور پیہم قربانیوں کا ظاہر میں جو ثمرہ نکلا وہ یہ تھا کہ ان کے اپنے اہل وعیال اور بعض قریبی اعزہ کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوطؑ، شعیبؑ، ہودؑ، صالحؑ اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیائے کرام (علیہم السلام) کی سرگزشت بھی کم وبیش اسی قسم کی ہے، پھر اسی مقدس گروہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام جیسے حضرات بھی موجود ہیں جن کی تبلیغ وہدایت کا انجام یہ ہوا تھا کہ حق کا فدائی تو انھیں ایک نہ ملا۔ لیکن ان میں سے کسی کی گردن اڑا دی گئی اور کسی کے سر پر آرے چلا دیے گئے۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ (آل عمران 3:21)

اور قریب آ کر دیکھیے' خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اس واقعیت کا سب سے

واضح اور مفصل ثبوت ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آپؐ کی پیغمبرانہ ذمے داریاں ہر نبی سے زیادہ تھیں۔ کیونکہ آپؐ کو جو دین قائم کرنے کے لیے دیا گیا تھا' وہ جامع ترین دین تھا۔ دوسری طرف اس دین کا مخاطب کسی ایک مخصوص قوم اور ملک کے بجائے پورا عالم انسانی تھا' اور اس عالم انسانی کا یہ حال تھا کہ اس کے ایک ایک گوشے میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپؐ جب منصب نبوت پر سرفراز ہوتے ہیں تو حکم ہوتا ہے کہ:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ الحجر 94:15

جس تعلیم کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اسے واشگاف پہنچا دو اور مشرکوں سے کنارہ کش رہو۔

آپؐ اس حکم کی تعمیل میں جیسا کہ چاہیے تھا' کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنی دعوت لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اسے فطری رفتار سے وسعت دیتے جاتے ہیں۔ چند سال بھی نہیں گزرنے پاتے کہ یہ پکار گھروں' گلیوں' مجلسوں اور قرابتی حلقوں سے آگے بڑھ کر پہاڑ کی چوٹیوں سے بلند ہونے لگتی ہے' سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اس کو اگر پروا ہوتی ہے تو صرف اس بات کی کہ جس کلمۂ حق کو پہنچانے کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کو پہنچا دینے میں کوئی کسر نہ رہ جائے یا پھر اس بات کی کہ بھٹکتی ہوئی انسانیت کی نجات اور بہبود جس صداقت پر منحصر ہے اس کو یہ سنتی اور مانتی کیوں نہیں؟ اس کی ساری تمنائیں بس اسی ایک تمنا میں آ کر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے اور جس دین کو اللہ نے میرے ذریعے نازل فرمایا ہے اس کے بندے اپنے کو اس کے حوالے کر دیں مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار اور محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمھارا کام امرِ حق کو صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر بیان کر دینا ہے اس کے بعد اگر ایک شخص بھی اسے سن کر نہیں دیتا تو اس کی پروا نہ کرو (فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ النحل 82:16) اس لیے تم اپنی دعوت کا کام انجام سے بالکل بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو' یہ نہ سوچو کہ کیا

ہو گا؟ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی ہی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے دشمنوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ لو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو:

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ ۞ یونس 46:10

اور اے پیغمبرؐ! جس عذاب کی ہم ان منکروں کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم تمہیں دکھا دیں گے (اور تمھاری نگاہوں کے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دو چار ہو لیں گے) یا (اس کے قبل ہی) ہم تم کو وفات دے دیں گے۔ کیونکہ ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر آنا ہے، پھر یہ کہ ان کے سارے اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

یہ تاریخ انبیاء کے چند مشہور و معروف ابواب ہیں جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی ہدایت اور سبق آموزی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں، ان سرگزشتوں میں اتباع حق کا جو اصول سب سے زیادہ نمایاں' اور جو نقشِ حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں۔ نہ حالات کی سازگاریوں کا اندازہ لگانے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کا کسی کو حق ہے۔ جو چیز ہمارا فریضہ زندگی قرار پا چکی ہے وہ ہر حیثیت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے پوری پوری جدوجہد کرتے رہیے۔ وہ فرض دراصل دل سے فرض مانا ہی نہیں گیا جس کو مشکلات کے اندیشے سرد خانے میں ڈلوا دیں اور جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا جائزہ لینا صحیح ہوتا تو یقین جانیے کہ انبیا کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا نام بھی زبان پر نہ لاتی۔ اس کے لیے عملی جدوجہد کا تو کیا سوال پیدا ہوتا؟ کیونکہ انبیاءعلیہم السلام اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں عموماً بھیجے ہی اس وقت جاتے تھے جب اس کام کے لیے حالات کی ناسازگاریاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہوتی تھیں۔ اور جب کلمۂ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا ہوتا تھا۔ لیکن حالات کی ان شدید ناسازگاریوں اور امکان کامیابی کی بظاہر انتہائی کم یابیوں کے باوجود جن سے ہم اپنے

زمانے کی ناسازگاریوں اور دِقتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کر سکتے انھوں نے بلاتوقف کشتی سمندر میں ڈال دی' اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پُرسکون ہے یا طوفانی؟ ہوا موافق ہے یا مخالف؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر پیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا پانی کے اندر چٹانیں ہیں؟ اس طرح کا کوئی ایک بھی سوال نہ تھا' جس نے ان کے ذہنوں میں کبھی بار پایا ہو۔

پھر اب وہ کن لوگوں کا اسوہ ہے جو اس معاملے میں ہماری رہنمائی کا حق رکھتا ہے؟ اور جس کی سند پر ہم مشکلوں اور ناسازگاریوں کے پیش نظر اپنے مقصد وجود سے عارضی طور پر بھی ''تائب'' ہو جا سکتے ہیں؟ انبیاء علیہم السلام کا تو جو اسوہ ہے' آپ نے دیکھا وہ اس طرح کی کوئی رعایت ہمیں دینے کے لیے بالکل تیار نہیں۔ ہاں اگر ہم نے انبیا علیہم السلام کی سرگزشتوں کو عملاً خدانخواستہ' مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاولین کی حیثیت دے رکھی ہے' اور انھیں ایسی گزری ہوئی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کو ہمارے افکار و اعمال کا رخ متعین کرنے میں کوئی دخل ہی حاصل نہیں' تب تو بات ہی دوسری ہے لیکن اگر صورتِ واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری بدبختیوں نے ابھی تک ہمیں نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ کی حد تک نہیں گرایا ہے بلکہ ہم ان سرگزشتوں کو اسی ہدایت کا مینار اور بصیرت کا سرچشمہ یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن بتاتا ہے تو ان کے ورق ورق سے ہمیں یہی ہدایت ملے گی کہ جو چیز تمھارا فریضہ حیات قرار پا چکی اس کی خاطر جدوجہد تم کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

ناسازگاریٔ احوال کا واقعی تقاضا

کہا جائے گا کہ حالات بہرحال اپنا ایک وزن رکھتے ہیں اور انسان کے فکر و عمل پر لازماً اثرانداز ہوتے ہیں اس لیے عقل یہ کس طرح تسلیم کر لے کہ دعوت حق کے سلسلے میں وہ کسی اعتنا کے قابل ہیں ہی نہیں؟ بلاشبہ یہ ایک صحیح اور معقول بات ہے اور اس کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اوپر کی سطروں میں یہ بات کب اور کہاں کہی گئی ہے کہ حالات کا

دعوت حق کی جدوجہد پر اثر بالکل پڑتا ہی نہیں؟ ان میں تو جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات کی ناسازگاریاں اس جدوجہد کو ملتوی یا منسوخ نہیں کرا سکتیں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ اس جدوجہد پر کس حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جتنی ہی زیادہ سخت و شدید ہوتی ہیں اس جدوجہد کو اتنا ہی زیادہ ضروری بنا دیتی ہیں؟............ یہ جواب نقل اور عقل دونوں ہی کا ہے۔

(۱) چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی عموماً ایسے ہی وقت میں اس کام پر مامور کیا جاتا رہا ہے جب کہ حق کی روشنی اس زمین سے بالکل ہی مفقود ہو چکی ہوتی تھی اور کفر و مادیت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کی دعوت کا امکان کامیابی دور دور تک بھی کہیں نظر نہ آتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول سے زیادہ مانوس ہے اور حق تعالیٰ کی مرضی اسی بات میں ہے کہ اس طرح کے تاریک حالات میں صداقت کا چراغ ضرور جلایا جائے اور اس کے بندے اس کے دین کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہوں اس سے ہرگز دریغ نہ کریں اور یہ غالباً اس لیے کہ اس کی رافت و رحمت کو اس گہری تاریکی کا اور بڑھ جانا گوارا نہیں رہ جاتا۔

(۲) ٹھیک یہی بات عقل بھی کہتی ہے، وہ کہتی ہے کہ جب اللہ کا دین نوعِ انسانی کے لیے ہدایت اور روشنی ہے تو جس جگہ کا انسان جتنا زیادہ گمراہی اور تیرگی کا شکار ہوگا اس جگہ اس ہدایت اور روشنی کی ضرورت بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ دعوت حق کے لیے سخت و شدید ناسازگاریوں کے معنی یہ ہیں کہ حق سے بے اعتنائی اور دوری حد سے آگے بڑھ چکی ہے اور لوگ اندھیارے سے محبت کرنے لگے ہیں، اس لیے ان ناسازگاریوں کا واقعی تقاضا صرف یہی ہوگا کہ جو لوگ انسانیت کو نور حق دکھانے پر مامور ہیں وہ خاموشی کو اپنے اوپر حرام کر لیں اور اونچی سے اونچی آواز میں انھیں اپنا پیغام سنائیں جو ہلاکت کی راہ پر اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اگر دوسری طرح کے حالات میں ان کے لیے کچھ سہل انگاری کی گنجائش مان بھی لی جائے تو کم از کم اس طرح کی غیر معمولی حق بیزاری کی حالت میں ایسی کوئی گنجائش

قطعاً نہیں مانی جاسکتی۔ حفظان صحت کا کوئی محکمہ اگر وبا پھوٹ پڑنے پر بھی خوابِ خرگوش سے نہ جاگے تو اس کی فرض شناسی کی داد کون دے سکتا ہے؟

عقل اور نقل دونوں کے اس متفقہ جواب کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس زمانے میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بے گانہ ہوں' دہریت اور مادیت کی جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو' طاغوت کی حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع' ہمہ گیر' اور پائیدار ہو، حق کے علمبرداروں پر دینُ اللہ کی اقامت کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر موجودہ حالات کے بارے میں یہ اندازہ صحیح ہے کہ اس وقت دنیا حق سے بری طرح متنفر اور برگشتہ ہو رہی ہے اور اسے اس کا نام سننا بھی گوارا نہیں ہے تو یہ صورت حال اقامتِ دین کی جدوجہد میں کسی رعایت کی موجب بالکل نہیں ہوتی بلکہ یہ مطالبہ اس بات کا کرتی ہے کہ اس مہم کو معمول سے زیادہ جوش' سرگرمی اور انہماک سے انجام دیا جائے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے تو معاملے کی اہمیت اور بھی آگے بڑھی ہوئی معلوم ہوگی۔ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں رہ جائے گی کہ اقامت دین کی جدوجہد امکان وعدم امکان کی بحث سے بالاتر ہے اور اس کو ہر وقت' ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس حد کو پہنچ جائے گی کہ اگر حالات کے اندازے اس جدوجہد کی ناکامی کا یقین دلا رہے ہوں، حتیٰ کہ بالفرض اگر کوئی اپنی آنکھوں سے نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کے لیے اس میں لگے رہے بغیر چارہ نہیں۔ کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں جیسی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس سے دست کش ہو جانے میں بھی کوئی حرج نہ ہو۔ نہ یہ مسلمانوں کے سر پر کوئی اوپر سے چپکی ہوئی ذمے داری ہے کہ چاہا تو قبول کر لیا ورنہ ٹھکرا دیا۔ اور اگر قبول بھی کر لیا تو پھر جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کر دیا۔ اس کے برعکس ایک شخص کے مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں انسان ان کو خود بھی اپنائے اور انھی کو اپنے گردوپیش بھی زندہ اور کارفرما

دیکھنے کا دل سے آرزومند ہو اور انھیں کارفرما بنا دینے کے لیے ہمہ دم کوشاں رہے۔ اسی طرح ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لیے بے قرار اور مصروف تگ و تاز نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور خلاف حق ہوں۔ چنانچہ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ حقیقت بالکل واضح کی جا چکی ہے کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں۔ لہٰذا منکرات کو مٹانے اور ان کی جگہ معروفات کو قائم کرنے کی جدوجہد، جو اقامتِ دین کی جدوجہد ہی کا دوسرا نام ہے، اسلام سے علیحدہ اور اس پر زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی اصل روح اور اس کی حرکتِ قلب ہے۔ اگر یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی جاندار زندہ تو ہو مگر اس کے قلب میں حرکت نہ ہو تو اسی طرح یہ بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص ہو تو مومن، مگر اقامتِ حق کی تڑپ سے اس کے دل و دماغ خالی ہوں اور عملی جدوجہد سے اس کے دست و بازو یکسر ناآشنا، اس تڑپ سے خالی اور اس جدوجہد سے ناآشنا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب دراصل اپنے مقصدِ حیات ہی سے کنارہ کش ہو جانے کے ہیں جس کے بعد ظاہر ہے کہ مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق جنھوں نے کہ اپنے اس مقصدِ زندگی کو فراموش کر رکھا تھا، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو تم کسی اصل پر نہیں ہو اور تمھارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔ (لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ (المائدہ 68:5)) اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانے میں اقامتِ دین ناممکن ہے گویا یہ کہنا ہے کہ اس زمانے میں مسلمان ہونا ممکن نہیں ہے اور حالاتِ زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست بردار ہو جانے کو بھی غلط نہ سمجھا جائے۔

غیرت کا سبق:

یہ بات کہ جو چیز زندگی کا اصل فریضہ قرار پا چکی ہو وہ امکان اور عدم امکان کی بحث سے بالاتر ہو جاتی ہے، کچھ اسلام اور مسلمان ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ایک عام اور

مسلم حقیقت ہے۔ چنانچہ انبیاء اور ان کے سچے پیروؤں نے اس مطالبے کو پورا کر دکھایا ہے تو کافروں اور دہریوں کے یہاں بھی اس مطالبے کو ایک واجب التسلیم مطالبے ہی کی حیثیت حاصل ہے اور وہ بھی نصب العین کے معنی یہی سمجھتے ہیں کہ نصب العین وہ چیز ہے جو آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہو۔ جو زندگی کے میدان میں آنے کے لیے ایسے حالات کی اجازت کی محتاج نہ ہو، جو ماحول کی سازگاریوں کی خواہش مند تو ہو مگر ناسازگاریوں سے خوف بھی نہ کھاتی ہو اور جس کی خاطر جدوجہد میں اگر زندگی ختم نہ کی جا سکے تو وہ بالکل رائیگاں ہے، چنانچہ ان کی تاریخ اس بات کی عملی شہادتوں سے بھری پڑی ہے۔

مارکس کے پیروؤں ہی کو لے لیجیے، اس کے چند مخصوص نظریات تھے جن پر وہ ایمان لائے اور انھی نظریات کی اقامت کو انھوں نے انسانی مسائل کا صحیح حل سمجھا۔ اس لیے اسی کام کو انھوں نے اپنی زندگیوں کا نصب العین بنالیا اور اس کے لیے پوری یکسوئی اور کامل انہماک سے سعی و جہد شروع کر دی۔ یہ سعی و جہد سب سے زیادہ زور وقوت سے اس مملکت میں شروع کی گئی جس میں وقت کی سب سے مستبد حکومت قائم تھی۔ جہاں زار نکولس کی شخصی آمریت اور قہاریت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرے اور حکومت کی تنظیم کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دینے والوں نے ان دشواریوں' ناسازگاریوں اور مصیبتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں جو اس جدوجہد کے پردے میں چھپی انھیں گھور رہی تھیں۔ جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہنچی تو وہ ظلم اور انتقام کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا۔ کتنوں ہی کو تو اس نے موت کے گھاٹ اتار دیا' جو بچ رہے ان کو سائبیریا کے برفانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ممکن صورت ایسی نہ تھی جس سے اشتراکیت کے ان ''مومنوں'' کو سابقہ نہ پڑا ہو۔ سالہا سال تک دار و گیر کا یہی ہنگامہ بپا رہا۔ مگر کوئی بڑی سے بڑی مصیبت اور ناسازگاری بھی ان کے عزم کو نہ ہلا سکی اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے طوفانوں سے انھیں برابر لڑاتا رہا اور منزل مقصود کی طرف ان کے قدم لگاتار

بڑھواتا ہی رہا۔

انھی اشتراکیوں میں آگے چل کر جب کہ وہ زار کا تخت سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے باہم اختلاف ہو گیا۔ لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور اسٹالن کے ہاتھوں میں آ گئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظام کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو اصول اشتراکیت سے فی الواقع بالکل ہٹی ہوئی پالیسی تھی اور دراصل مارکسی نظریات کے ساتھ کھلی ہوئی غداری تھی ٹراٹسکی نے اختلاف کیا' اور اشتراکیت کی اصلی روح اور خالص مارکسیت کے قائم کرنے اور قائم رکھنے پر زور دیا۔ اسٹالن نے نہ صرف یہ کہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کو اس جرم کی پاداش میں حکومتی ادارے سے ہی نکال دیا۔ خفیہ پولیس نے اس پر اور اس کے ہم خیالوں پر کڑی نگرانی عائد کر دی اور اس کی زبان پر تالے چڑھا دیے گئے۔ مگر وہ جن اصولوں پر ایمان رکھتا تھا اور جن کے نفاذ میں اس کو دنیا کی فلاح نظر آ رہی تھی ان کی تبلیغ سے وہ باز نہ رہا۔ آخر جلاوطن کر دیا گیا۔ امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے مشن کو پھیلانے اور اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے دشمن وہاں بھی پہنچے' اور ایک روز سازشوں کے ذریعے انھوں نے اس کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا' جسے مارکسیت کے اس ''مومنِ قانت'' نے نہایت صبر وسکون کے ساتھ قبول کر لیا اور اپنے مقصد و نصب العین پر قربان ہو گیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں' ذرا قریب کی تاریخ دیکھیے، یہ جاپانی اور جرمن قومیں جو زخموں سے چُور آپ کے سامنے پڑی ہیں ان کے واقعات سنیے۔ ان کے رہنماؤں نے ان کے سامنے ایک نصب العین رکھا۔ وہ ان پر ایمان لائیں اور پھر اس کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں۔ حریف قوموں نے آگا روکا۔ انھوں نے اس روک کو تلوار کی نوک سے دور کرنے کی ٹھان لی۔ لڑائی کا میدان گرم ہو گیا اور یہ دونوں قومیں اپنے اپنے دائروں میں سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگیں اور چند ہفتوں کے اندر اندر ہزاروں مربع میل علاقوں پر

قابض ہوگئیں۔ مگر قسمت نے یکا یک پلٹا کھایا تو پھر اسی تیزی سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئیں اور تباہیوں کی ان پر بری طرح بارش ہونے لگی۔ مگر اپنے نصب العین کا یہ عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے اور اس میں کود جاتے۔ ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا پڑتے۔ بموں سے لدا ہوا ہوائی جہاز لے کر ان کے جہازوں پر جا گرتے۔ اور اس طرح دنیا کی جنگی لغت میں ''خودکش ہوائی جہاز'' اور ''کفن بردوش طیارے'' کی اصطلاحوں کا اضافہ کر گئے۔ پھر آخر میں جب قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں قطعی حد تک ناکام بنا دیا تو وہ اس عقیدے کے ساتھ ''ہرکیری'' (خودکشی) کرنے لگے کہ مرنے کے بعد دیوتا بن کر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے۔ اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش اس جذبے سے کرنے لگیں کہ یہ بڑے ہوکر دشمنوں سے اپنی قومی عظمت کی تباہی کا انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں۔ جن کی قربانیوں کا کوئی ثمرہ مرنے کے بعد ان کی اپنی ذات کو ملنے والا نہیں۔ اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لیے عبرت کا کوئی درس اور غیرت کا کوئی پیغام نہیں؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادت اُخروی میں اتنی بھی گیرائی نہیں جتنی کہ ان چند روزہ مادی مقاصد میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی بھی حرارت نہیں ہوسکتی جتنی کہ ایمان بالطاغوت میں دیکھی جارہی ہے۔ کیا حق کی شہادت میں اتنی بھی جرأت نہیں دکھائی جانی چاہیے جتنی کہ باطل کی شہادت میں اس کے ماننے والے دکھایا کرتے ہیں؟ اور کیا اپنے فریضۂ حیات کو اتنی اہمیت بھی اہل اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی کہ اہل کفر دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور روح کی غیبی تائید کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے، مگر اہل کفر وضلال کی ان سرفروشیوں کے پیچھے کس معجزے اور غیبی تائید کا سراغ بتایا جائے گا؟ کاش ہم .... امکان وعدم امکان کی

بحثیں چھیڑتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال واخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے اور انھی سے مقصدِ زندگی کا حق ادا کرنا سیکھ لیتے۔ افسوس یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے۔ جن کی نظر اسی عالم آب وگل تک ہے وہ تو ادائے فرض میں فکر انجام سے اتنے بلند ہوں اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ ہماری نماز اور ہماری قربانی' ہماری زندگی اور ہماری موت سب کچھ صرف اللہ کے لیے ہے' ناکامی کے اندیشے ڈھونڈنے میں مصروف ہیں۔ جو نقشِ حقیقت ایک اندھا ملحد بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو ذرا سجھائی نہیں دیتا۔

جذباتیت کا بے بنیاد طعنہ

اگرچہ اس تقریر کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ادائے فرض کے سلسلے میں امکان کی بحث پیدا ہی نہیں ہوتی اور ایمان کی غیرت اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتی۔ نیز ایمان کی غیرت تو الگ رہی کوئی خود دار اور باحمیت کفر بھی اس کا روادار نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کے باوجود ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ بات اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں شاید ہی گھس پائے گی اور ہرگز خلاف توقع نہ ہوگا اگر دانش وتدبر کے کتنے ہی دعویدار اک خاص بزرگانہ شان سے بول اٹھیں کہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ ''اہل دانش'' کے اس ریمارک کو بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا اگر قبول کرنے کی کچھ بھی گنجائش ہوتی' کیونکہ ذمے داری کا ایسا بھاری بوجھ اٹھانے اور خطروں سے اس طرح رُندھی ہوئی راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہو سکتا مگر دشواری یہ ہے کہ اس رائے کے قبول کرنے سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی بلکہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں کیونکہ پھر وہی عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور کھلم کھلا اس جذباتی طرز عمل کی تلقین کرتا ہو۔ اگر ایک شخص کسی دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی پس وپیش نہ کرے اگر اس کے دین کا بالفرض اس سے یہ مطالبہ ہو' لیکن اگر وہ اس کے مطالبات کو سن کر ٹال دیتا

ہے اور انھیں ''جذباتی'' .... دوسرے لفظوں میں ''نا قابلِ عمل اور غیر معقول'' خیال کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقع اس کا اس پر ایمان ہی نہیں، اس کا ایمان اگر ہے تو اپنی عقل وفہم پر ہے، اس لیے ایمان داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تعیین کرلے۔

لیکن کیا واقعتاً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس مطالبے کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کی ہماری عملی زندگی میں کوئی اہمیت اور ضرورت بالکل ہے ہی نہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ پچھلے صفحات میں جو بحثیں کی جا چکی ہیں ان میں اس خیال کی تردید کا پورا پورا مواد موجود ہے۔ رہ گیا دوسرا سوال تو تھوڑے سے غور وفکر کے بعد اس کا جواب بھی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ جائزہ لے کر دیکھیے کہ دنیا میں بڑی بڑی مہمیں کس طرح سر کی جایا کرتی ہیں؟ آیا محض نظری فلسفوں ہی سے یا جذبات کی مدد بھی ضروری ہوتی ہے؟ یہ جائزہ آپ کو یقیناً اس نتیجے پر پہنچائے گا کہ کسی بھی بڑے کام میں کامیابی کا انحصار عقل، اور جذبات دونوں پر ہوتا ہے۔ اس میں جس طرح عقل وتدبر کے ٹھنڈے فلسفوں سے بے اعتنائی نہیں برتی جاسکتی اسی طرح جذبات کی گرم لہروں سے بھی بے نیازی ممکن نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دونوں کے وظائف الگ الگ ہو سکتے ہیں اس لیے اگر وہ کام جو عقل کے کرنے کا ہے جذبات کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تو اس کا نتیجہ لازماً ناکامی ہی کی شکل میں نمودار ہوگا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی مقصد کی تعیین تو صرف عقل ہی کرتی ہے۔ یہ عقل ہی کا کام ہے کہ پوری پوری چھان بین کر کے بتائے کہ انسان کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہئے پھر یہ کہ کرنے کے کاموں میں سے کون سے کام صرف بہتر ہیں اور کون سے ضروری؟ نیز جو ضروری ہیں ان کے مراتب کیا ہیں۔ ان میں سے کس کی حیثیت بنیادی قسم کی ہے اور کس کی غیر بنیادی نوعیت کی؟ جب اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ دے دے تو پھر انسان پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف کاموں کو اپنے پروگرام میں وہی جگہ دے جو اس

نے دینے کو کہا ہو اور اس طرح صرف اسی چیز کو اپنے لیے ضروری یا بنیادی اہمیت کی مالک ٹھیرائے جسے اس کی عقل ایسا ٹھیرا چکی ہو، اور اس مسئلے میں اپنے جذبات کو چوں کرنے کی بھی اجازت نہ دے۔ ورنہ اسے بجا طور پر جذباتی اور احمق کہا جائے گا مگر جب عقل اپنا فریضہ انجام دے چکی اور گہرے سوچ بچار کے بعد ایک شے کو ضروری قرار دے چکی تو اب وہ موقع آجاتا ہے جہاں جذبات کی شرکت اور ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے کیونکہ آگے عقل محض کے بس کا یہ کام ہے ہی نہیں کہ وہ اس منزل مقصود کی طرف قدموں کو مطلوبہ رفتار سے بڑھا سکے۔ یہ کام وہ اسی وقت انجام دے سکتی ہے جب جذبات کی معاونت بھی حاصل کر لے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات تو یہ ہے کہ یہاں عملی اہمیت کے لحاظ سے جذبات عقل پر بھی مقدم ہو جاتے ہیں۔ معاملے کے یہاں تک پہنچ چکنے کے بعد اب دراصل یہ جذبات ہی ہوتے ہیں جو دلوں میں عمل کا ولولہ اور قدموں میں حرکت اور اقدام کا وہ جوش پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے۔ یہ جذبات اگر آمادۂ کار نہ ہوں تو عمل کی قوتیں سوئی پڑی رہ جائیں گی اور مقصد کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی انھیں جھنجھوڑ کر بیدار نہ کر سکے گی۔ یوں کہیے کہ عقل صرف سمت سفر متعین کرتی اور انجن اور پٹڑی تیار کرتی ہے مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزل مقصود تک اسے دوڑا دینے والی اسٹیم (steam) یہی جذبات مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی کی تعمیر میں اور اہم مقاصد کے حصول میں یہ مقام غاصبانہ طور پر حاصل نہیں کیا ہے بلکہ ان کا یہ ایک فطری حق ہے اور عقل نے اس حق کو تسلیم کرنے سے کبھی انکار نہیں کیا ہے، اس لیے جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت ہے، اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا بھی عقلیت ہی ہے، جذباتیت نہیں ہے۔

عقل اور جذبات کے ان الگ الگ وظائف کو سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے فیصلہ کیجیے کہ جب اس نے پورے اطمینان کے ساتھ اسلام کو اللہ کا واجب الاتباع دین مان لیا تو اس کے مطالبات کی تکمیل میں جذبات کی پوری قوت لگا دینا آیا جذباتیت ہے یا

عقلیت؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کا فیصلہ یہی ہوگا کہ یہ خالص عقلیت ہے۔ لہٰذا اسلام پر ایمان رکھنے اور اقامت دین کو اپنا فریضۂ حیات تسلیم کرنے کے باوجود اس کے لیے اٹھ کھڑے ہونے سے لیت ولعل کرنا دانش مندی نہیں بلکہ دانش فروشی ہے۔ عقل وتدبر کا نام لے کر عقلیت کو رُسوا کرنا ہے۔

غلط روی کے اسباب

بحث کے ان سارے پہلوؤں کے روشن ہو جانے کے بعد ذہن میں قدرتاً ایک بڑا نازک سوال ابھرنے لگتا ہے اور وہ یہ کہ جب بات اتنی واضح تھی تو پھر لوگ حالات کی سازگاریوں اور ناسازگاریوں کی بحث میں کیوں جا الجھے؟ اور امکان وعدم امکان کے اس مسئلے نے ان کے ذہنوں میں کہاں سے بار پالیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے فریضہ حیات سے یوں بے تعلق ہو کر رہ گئے۔ حقیقت کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے، مگر جہاں تک انسانی فہم کی رسائی کا تعلق ہے یہ غلط روی بظاہر ان دونوں باتوں کو نہ سمجھ پانے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے:

ایک تو یہ کہ اقامت دین کے فریضہ حیات ہونے' اور پھر اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے اصل معنی کیا ہیں؟

دوسری یہ کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟

اس لیے اگر ان دونوں باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے اور ذہن کو ٹھیک اس سانچے میں ڈھال لیا جائے جو قرآن عطا کرتا ہے تو پھر نہ حالات کی ناسازگاریوں کا کوئی سوال باقی رہے گا' نہ امکان اور عدم امکان کی بحث پیدا ہوگی۔

مومن کی اصل ذمّے داری

جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت اہلِ ایمان پر فرض ہے تو اس کا مطلب غالباً یہ لے لیا جاتا ہے کہ زمین پر اسلامی نظام زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینے کو ہمارا فرض کہا جا رہا ہے حالانکہ یہ صریح غلط فہمی ہے۔ ہم پر تو جو چیز فرض ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پرسش ہوگی وہ دین کو بالفعل قائم کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کر دینے کی اپنی

پوری طاقت سے جدو جہد کرنا ہے۔ جس نے یہ کرلیا وہ اپنے فرض کو پورا کر گیا' اگر چہ ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو'اور ایک ذرّہ زمین پر بھی وہ دین حق کو قائم نہ کر پایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اٹھا سکتا ہے (لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط البقرہ 286:2) اس نے کسی پر کوئی ایسی ذمے داری ڈالی ہی نہیں ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زیادہ ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ ہم اس کا تقویٰ اختیار کریں مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری واقعی سکت سے بڑھ کر نہیں ہے بلکہ اسی حد تک ہے کہ ہماری خلقی استطاعت کے بس میں ہو۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ التغابن 16:64

اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس قدر تم کر سکتے ہو۔

یا مثلاً مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعدائے دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑ ڈالنے کے لیے تیار رہیں مگر اس کے لیے ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو دشمنوں کی قوتِ جنگ کے برابر قوت لازماً فراہم کریں۔ بلکہ صرف یہ کہا گیا ہے اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ الانفال 60:8

دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اتنی قوت تیار رکھو جتنی کہ کر سکتے ہو۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب لوگ اطاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ ان کے الفاظ بیعت میں خود اپنی طرف سے تاحد استطاعت کی قید بڑھا دیتے' چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں:

كُنَّا نُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُ (مسلم، جلد دوم)

ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع وطاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ فرماتے کہ یہ بھی کہو کہ جہاں تک میری طاقت میں ہوگا۔

غرض دین کا یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی بجا آوری کا جو مطالبہ فرمایا ہے وہ انسان کی واقعی طاقت کی حد ہی تک کا ہے اس سے زیادہ کا قطعاً نہیں

ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اقامت دین کے معاملے میں بھی اس اصول کا لحاظ نہ ہو۔ یقیناً ہوگا اور اس کام میں حالات کی ناسازگاریاں، ماحول کی دقتیں اور ذرائع کی کم یابیاں جس قدر مزاحم ہوں گی اسی قدر ہمیں اللہ تعالیٰ کی جناب سے رعایت بھی ضرور ملے گی۔ اسی طرح مختلف افراد کے حق میں ان موانع کی نوعیتوں کا جو تفاوت ہوگا' اس تفاوت کا بھی پورا پورا لحاظ فرمایا جائے گا اور ہر فرد کو اس کے دربار عدل میں صرف اسی حد تک جواب دہی کرنی پڑے گی جس حد تک اسے جدوجہد کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو کام کے اچھے ذرائع اور ماحول کی سازگاریاں حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے مقدور بھر قیام دین کی کوشش بجا نہیں لاتا' تو لازماً ادائے فرض میں کوتاہی دکھانے کا مجرم قرار پائے گا۔ خواہ اپنی اس کم توجہی کے باوجود وہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو۔ اس کے بخلاف اگر دوسرے شخص نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن ذرائع کے ناپید اور حالات کے ناسازگار ہونے کے باعث آخر تک کچھ نہ کر پایا' اور بس منزل مقصود کی سمت اپنا رخ جمائے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا تو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ہر طرح اپنے فرض کو ادا کر گیا اور اللہ کے حضور اس پر کوئی الزام نہ لگے گا۔ اس لیے مومن کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ جیسی کچھ اسے طاقت حاصل ہے اور جس طرح کے حالات میں وہ ہو' انھی کے مطابق اپنی کوششیں انجام دیتا رہے۔ پھر جیسے جیسے ان حالات میں تغیر ہوتا' اور اس کی اپنی قوت کار میں فرق آتا جائے اپنی جدوجہد کا دائرہ بھی اسی کی مناسبت سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھیے' نماز ہم پر فرض ہے جس میں قیام' رکوع اور سجدہ وغیرہ چند چیزوں کا ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو لیکن دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد اس کی یہ مجبوری دور ہو جاتی ہو اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو تو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ باقی رکعتیں وہ کھڑے ہو کر

ہی پڑھے اور جیسے ہی اسے اپنے عذر کے جاتے رہنے کا احساس ہو جائے فوراً اٹھ کھڑا ہو۔ ٹھیک یہی حال اقامتِ دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اس وقت اتنی ہی جدوجہد اس کے لیے ضروری ہے۔ نہ اس سے زیادہ کا وہ مکلف ہے نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (گول) ہے جہاں تک پہنچنے کی مسلسل کوشش مسلمانوں کی منصبی ذمے داری ہے اور جہاں تک پہنچ جانا ہر مسلمان کی لازماً ایک محبوب آرزو ہونی چاہیے۔ مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا اس پر واجب ہرگز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اس پر جو کچھ واجب قرار دیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس گول کی طرف اتنے قدم آگے بڑھتا جائے جتنے قدم کہ وہ فی الواقع آگے بڑھ سکتا ہے۔

واقعی ناکامی کا عدمِ امکان

جب اقامت دین کے فرض ہونے کا مدعا یہ ہے تو یہیں سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ اس فریضے کی خاطر کی جانے والی جدوجہد میں کامیابی کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ جب اپنی استطاعت کے مطابق ہی کوشش کرنے کے ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا امکان باقی رہتا ہے؟ یہ تو وہ راہ ہے جو خود ہی راہ بھی ہے، خود ہی منزل بھی۔ دنیا کی دوسری تمام تحریکوں اور سرگرمیوں کا معاملہ تو ضرور ایسا ہے کہ ان میں پوری پوری کوشش کے باوجود کامیابی کا بھی امکان ہوتا ہے اور ناکامی کا بھی لیکن اقامت دین کی جدوجہد ایک ایسی جدوجہد ہے جس میں اگر پوری پوری کوشش انجام دے دی گئی تو پھر ناکامی کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہتا۔ کیونکہ مومن سے اس کے رب کا مطالبہ اس سے زیادہ کا ہے ہی نہیں کہ بس وہ اپنی طاقت اس کام میں لگا دے، اور اپنی آخری سانس تک لگائے رکھے۔ کل اس سے حساب بھی صرف اسی بات کا لیا جائے گا جس میں اگر ثابت ہو گیا کہ اس کا عمل ایسا ہی کچھ رہا ہے تو رضائے الٰہی اس کے لیے اپنی آغوش کھول دے گی اور آخرت کی فلاح سے وہ بہر حال شاد کام ہو کر رہے گا۔ اس لیے اس نے جب دنیا میں اس کوشش کا حق ادا کر

دیا واضح طور پر اپنی زیست کا مقصد اور اپنے ایمان کا بنیادی تقاضا پورا کر گیا تو اپنی زیست کے اصل مقصد اور اپنے ایمان کے بنیادی تقاضے کو پورا کر دینے کے سوا بھی کوئی چیز ہے جس کی تعبیر کے لیے کامیابی اور بامرادی کے الفاظ محفوظ کر لیے جانے چاہییں؟

ہاں اس راہ میں ایک ناکامی ضرور ہے اور وہ یہ کہ اپنی قوتوں کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمہ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے، اس کے علاوہ اس میں کسی ناکامی کا کوئی خدشہ ہی نہیں۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی و جہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہر حال کامرانی کا انجام ہے۔ مایوسی و نامرادی کے نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور

اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ دراصل اشیا کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر طرف ذہنوں پر چھایا ہوا ہے لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان بھی کسی چیز کے رد و قبول میں اسی دنیا میں ظاہر ہونے والے نتائج کو اور اسی زندگی کے نفع و نقصان کو سامنے رکھنے لگا ہے، اسی لیے وہ اس کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس میں کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ حالانکہ قرآن نے اسے ترک و اختیار کی بنیاد اور کامیابی کا مفہوم کچھ اور ہی بتایا ہے۔ اس کے نزدیک مسلمان کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہوتا ہے اور اپنی کامیابی صرف اس بات میں سمجھتا ہے کہ اپنی ساری پونجی قیام حق کی راہ میں لگا دے۔ اس کے بعد اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی، اور اگر سارے عالم پر دین حق کا جھنڈا لہرا دیتا ہے تب بھی، ہر حال میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔

ضرورت ہو تو قرآن کی واضح شہادت بھی سن لیجیے:

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب جو روم کے افق سے طوفانِ جنگ نمودار ہو رہا ہے وہ ان مٹھی بھر سر پھرے مسلمانوں کو جو تمام دنیا کو دشمن بنائے بیٹھے ہیں پوری طرح

اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ان کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا کہ:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ط التوبہ 52:9

(ان منافقوں سے) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو وہ ہمارے لیے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

یہ آیت جو کچھ کہہ رہی ہے اسے غور سے سن رکھیے۔ یہ صاف اعلان کر رہی ہے کہ جس طرح مسلمانوں کا میدان جنگ جیت جانا ان کے لیے بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح ان کا ہار جانا اور جاں بحق ہو جانا بھی بھلائی اور کامیابی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی فتح بھی ''حسنیٰ'' ہے اور ان کی شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو ہر صورت میں تمغۂ کامرانی ہی لے کر لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے اور حق کا بول بالا کر دے۔ لیکن دوسری صورت حال کو بھی ناکامی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی خدانخواستہ لڑائی میں قتل ہو جائیں تو ایک مومن کے حقیقی مطمحِ نظر کے لحاظ سے یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے۔ قابل صد رشک کامیابی، ایسی کامیابی جس پر دنیا کی ساری کامیابیاں قربان ہو جائیں۔ جس سے بڑی کامیابی کی آرزو ہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی ایمانی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشے سے ہے۔ اسی جزو سے کُل کی طرف آئیے اور اسی فرع کو اصل بنا کر مومن کی پوری ایمانی زندگی .... اقامت دین کی جدوجہد .... پر پھیلا دیجیے۔ پھر معلوم ہوگا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام، جن کو اسی جدوجہد کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق کا نفاذ نہ کر سکے تھے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جنھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا مگر اس کھلے راز کو بھی سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے مومن کا دل چاہیے۔ عقلِ مصلحت پرست کے اندر یہ جذباتی باتیں کہاں سما سکتی ہیں؟

عملاً قیام دین کے روشن امکانات

لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے بھی یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت اس کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کا دسواں بیسواں حصہ بھی اپنے اس فریضے کی انجام دہی میں دل وجان سے لگ جائے اور ٹھیک اسی طریقے سے لگ جائے جس کا اس کا مزاج تقاضا کرتا ہے اور جس کی کتاب وسنت اور اسوۂ انبیا سے ہدایت ملتی ہے، تو اس کوشش کا بارآور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح اندھیری رات کے بعد چمکتے ہوئے سورج کا نکلنا یقینی ہوتا ہے۔ اس دعوے کی حقانیت آپ پر بڑی آسانی سے واضح ہو جائے گی اگر ان چیزوں پر اور ان کے تقاضوں پر اچھی طرح غور کر لیں:

(۱) اقامت دین کے مخاطب اور ذمے دار گروہ کی خاص نوعیت

(۲) انسانی فطرت کی اصل پسند۔

(۳) انسان کا موجودہ فکری، عملی اور تمدنی ارتقاء اور اس کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی بے چینی۔

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی قدم پر ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ کام کسی بے اصول، خودغرض، تھڑ دلے اور پست نظر گروہ کے سپرد نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کے سپرد ہے جو مومن ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ یعنی جو قرآنی بیانات کے مطابق ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں اور اس کے سوا کسی کو پرستش اور رضا جوئی کا حق دار حقیقی اطاعت کا سزاوار اور طاقت واقتدار کا مالک نہیں سمجھتے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں اور اپنی زندگی کے کسی شعبے میں ان کے سوا کسی کو قابل اتباع نہیں تسلیم کرتے۔ جو آخرت کو دنیا پر ہمیشہ مقدم رکھتے ہیں، جو نماز، روزے اور حج وزکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجالانا والے ہوتے ہیں۔ جو حق کے شاہد، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل کے علمبردار، باطل کے حریف، منکر کے فطری دشمن، جھوٹ

سے متنفر اور ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ جن کی پہچان یہ ہے کہ وہ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹائیں۔ جن کا شعار یہ ہے کہ وہ انصاف پر قائم رہیں اگر چہ اس کی زد خود ان کے اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو۔ جن کا شیوہ یہ ہے کہ دشمن کے ساتھ بھی زیادتی کا سلوک نہ کریں اگر چہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں۔ جو ہر حال میں راستی پر قائم رہتے ہیں اگر چہ دنیا ہاتھ سے نکلی جاتی ہو۔ جو دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے اور دوسروں کی جان و مال کو حرمتِ کعبہ کا مستحق باور کرتے ہیں۔ جو غیر کے لیے بھی وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے لیے کرتے ہیں۔ جن کے دامن یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لیے امن وسلامتی کی پناہ گاہیں ہوتی ہیں۔ غرض جن کی زندگی اور جن کی موت، جن کی محبت اور جن کی عداوت سب اللہ کے لیے ہوتی ہے۔ اب اگر دنیا میں ''مومنوں'' کا کوئی گروہ موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی نہ کسی حد تک یہ صفات بھی اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب قیام دین کے امکانات کا جائزہ لیا جائے تو اسی گروہ اور اس کی انہی صفات کو سامنے رکھ کر لیا جائے۔ یہ نکتہ اگر نظر انداز ہو گیا تو ہرگز صحیح نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکتا۔ اور اگر یہ نظروں کے سامنے رہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ''ناممکن'' کا لفظ پھر بھی منہ سے نکل سکے۔ غور تو کیجیے، جو گروہ ایسے ایمانی اور اخلاقی اسلحوں سے مسلح ہو اس کے بارے میں یہ بدگمانی اور مایوسی کیسے کی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاتھوں دین قائم ہو ہی نہیں سکتا؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس کی عددی کثرت بھی غیر معمولی حد تک زیادہ ہو اور دنیا کی کسی اور پارٹی کے ممبروں کی تعداد اس کی آدھی تہائی بھی نہ ہو؟ یہ صحیح ہے کہ آج یہ بھاری گروہ جن افراد پر مشتمل ہے ان کی بہت بڑی اکثریت ان مذکورہ بالا صفات سے تہی دامن ہو چکی ہے۔ مگر یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اس گروہ میں ایسے لوگ باقی ہی نہیں رہے جن میں یہ صفات موجود ہوں، نہیں ایسے لوگ اب بھی نایاب نہیں ہیں۔ البتہ کمیاب ضرور ہیں۔ اگر خاکستر کی ان چنگاریوں کو دنیا میں اجالا پھیلانے کا خیال اور بھڑکنے کا ڈھنگ آ جائے تو یہ اندھیرے سنسار کو ایک دن جگمگا کر دم لیں گے۔

اب انسانی فطرت کو لیجیے۔ انسان اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑ کر عام افراد انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھنچ اٹھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ جو اس حالت کو دراصل اپنی فطرت کو مسخ کر لینے سے پہنچ جاتے ہیں دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ البتہ جب یہی گنتی کے شیطان انسانی زندگی کی اجتماعی مشینری پر قابض ہو جاتے ہیں اور قوموں کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے تو عام لوگ محض ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے برائی کی نجاستوں میں لتھڑ جاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود خیر پسندی کا فطری ذوق ان کے اندر سے فنا نہیں ہو جاتا۔ اس لیے اگر نظری اور عملی دونوں طریقوں سے نور حق ان کے سامنے بے حجاب کر کے چمکا دیا جائے تو ان میں سے کچھ تو اس کی طرف عملاً بھی لپک پڑیں گے اور دوسروں میں اگر اتنی جرأت نہ ہو گی تو اتنا ضرور ہی ہو گا کہ وہ اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیں گے۔ کوئی وجہ نہیں کہ عام انسان اس چیز کو اس کی اپنی صحیح شکل میں دیکھ لینے کے بعد بھی رد کر دے، جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے اور اس چیز سے بدستور لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔

آخری قابل لحاظ چیز جسے اس سلسلے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا زمانے کا ارتقائی رجحان اور انسان کی ذہنی بے چینی ہے۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی فکر اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی۔ دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں اور وہ اپنے دلوں کے دروازے بیرونی آواز کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے۔ تیسرے تبلیغ و اشاعت کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دین حق کی تبلیغ کے ظاہری نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوا کرتے تھے۔ مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی اور اوہام پرستی سے اونچا اٹھ رہا ہے اور روز بروز حقائق پسندی کی طرف آ رہا ہے۔ عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جا رہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب

نے جہاں دنیا کو بے شمار نقصانات پہنچائے ہیں وہیں وہ ایک ایسی کیفیت بھی ذہنوں میں پیدا کر گئی ہے جس سے ایک ایسا دین عظیم الشان فائدے حاصل کر سکتا ہے جو مسائل زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کر سکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بہت کچھ بنیاد ڈھادی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے۔ ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی ان مذاہب کی چھتیں بھی زمین پر آ گئی ہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے حصار ہی میں جی سکتے تھے۔ اس تہذیب کا جنم دراصل ایک فکری انقلاب کا نتیجہ تھا۔ ایک تو انقلاب کی فطرت ہی بحرانی ہوتی ہے، دوسرے، جہاں تک خاص اس انقلاب کا تعلق ہے تو اسے صحیح رخ پر موڑنے کی کوئی کوشش بھی نہ ہوئی۔ بلکہ اس کا راستہ روکا گیا اور وہ بھی نہایت بھونڈے بلکہ احمقانہ طریقے سے۔ اس لیے وہ اپنے جوش میں اوہام کے ساتھ بہت سے حقائق بھی بہالے گیا اور دیگر مذاہب کی طرح خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطریت اور عقلیت کی وجہ سے اس کا صحیح رہنما ہو سکتا تھا۔ مگر اس بے اعتدالی کے بکثرت تلخ نتائج اب اس کے علم برداروں کے سامنے آ چکے ہیں۔ اس لیے وہ اعتدال کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس انقلاب نے ذہنوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں بڑی حد تک ڈھیلی کر دی ہیں اور ایسے بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی بات کو صحیح سمجھ لینے کے بعد اسے تسلیم کر لینے میں اپنے روایتی معتقدات کو مانع نہیں پاتے۔ پھر فکر کی اس آزادی اور ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ وقت کے تمدنی، معاشی اور سیاسی حالات نے بھی اسلام کے لیے کچھ زمین ہموار کر دی ہے۔ جب سے نظام عالم کی سیاسی باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال کر زندگی کے نظام کو اپنے من مانے اصولوں پر چلانا شروع کیا ہے، اس وقت سے نوع انسان برابر اپنی خودسری کے برے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی دماغ کے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے زندگی ایک ایک کر کے ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ناکام ثابت ہو چکے ہیں بلکہ ان کی پیدا

کی ہوئی پیچیدگیوں اوران کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی فی الواقع طلبگار ہے جواس کے دکھوں کا مداوا کر سکے۔

صورت واقعہ کے ان تینوں روشن پہلوؤں کو نگاہ میں رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ دین کا قیام ممکن ہے یا ناممکن؟ کیا یہ صورت واقعہ ڈرنے' سہمنے' اور مایوس ہونے کی ہے؟ اگر نہیں' تو وہ لوگ کیوں نہ پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھیں جو ایک طرف تو اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ پورا حق صرف اسلام کے پاس ہے اور زندگی کے مسائل کا صحیح اور تسلی بخش حل اس کے سوا اور کہیں ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف انھیں اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ انسان بھلائی کا فطری طلب گار اور خدا کی بہترین مخلوق ہے۔ پیدائشی مجرم اور بدی کا پجاری نہیں ہے۔ البتہ ان لوگوں سے اس طرح کے کسی اقدام کی توقع رکھنا ضرور غلط ہوگا جن کے اندر کا یہ یقین رسمی عقیدت کی حدوں سے آگے نہ بڑھا ہو۔ کیونکہ ایسے ''اہل ایمان'' خواہ اسلام کے ان فضائل و محامد کا کیسے ہی فخر اور جوش سے اظہار کرتے ہوں اور اس کی شان میں کیسے ہی عمدہ قصیدے پڑھتے ہوں مگر چونکہ ان کی مدح سرائیوں کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں نہیں ہوتیں اس لیے وہ عمل و اقدام کے پھل بھی نہیں دے سکتیں۔ ایسے لوگ اگر خدا کے دین سے مایوس ہوں تو انھیں مایوس ہونا ہی چاہیے اور خود یہ دین بھی ان سے مایوس ہی ہے مگران لوگوں کے لیے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کی ان خوبیوں اور صلاحیتوں پر اپنی عقل اور بصیرت کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو انھیں جاننا چاہیے کہ دنیا کے عام حالات اور انسانی حقائق آج اسلام کے حق میں ہیں۔ آگے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ جو فکری اور عقلی طاقت انھیں حاصل ہے اسے وہ اسی کام پر مرکوز کر دیں کہ یہ دنیا بہر حال اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں جو کام بھی انجام پاتا ہے اپنے مقررہ طرز ہی پر انجام پاتا ہے۔ آپ کے اپنے دسترخوان کا لقمہ بھی آپ کے منہ میں نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کے لیے آپ اپنے ہاتھ کو حرکت نہیں دیتے۔ اس لیے حالات کسی نصب العین کے حق میں کیسے ہی سازگار کیوں نہ ہوں' وہ کامیابی کی منزل پر اس

وقت تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا، جب تک کہ اس کے لیے ضروری تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں زیر عمل نہ لائی جاچکیں۔ اقامت دین.......... کا نصب العین بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے، اس لیے ان تمام روشن پہلوؤں کے باوجود جن کا ابھی تذکرہ کیا جاچکا ہے اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہوسکے گی جب کہ اس کے لیے مناسب تدبیریں اور مطلوبہ کوششیں اختیار کرلی جائیں۔

یہ تدبیریں اور کوششیں کیا ہیں؟ ان کو دو لفظوں میں اسلام کی ''فکری'' اور ''عملی'' شہادت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

فکری شہادت تو یہ ہے کہ اسلام کا بیسویں صدی کی زبان میں تعارف کرایا جائے اور آج کے ذوق و ذہن کو اپیل کرنے والے طرز استدلال سے اسے مدلل کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اس نے جو ہدایات و احکام دیے ہیں انھیں زمانۂ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر لوگوں پر واضح کردیا جائے کہ انسانی مسائل کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف انھی ہدایات میں مضمر ہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ عمل کی زبان سے بھی اس پر اپنے یقین کا اظہار کیا جائے اور مشکل سے مشکل مواقع میں بھی اس کی راہ راست سے قدموں کو ہٹنے نہ دیا جائے' اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ عبادتوں میں وہ روح پیدا کی جائے جس سے دلوں میں زندگی اور سیرتوں میں پاکیزگی آتی جائے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے معاملات میں اسلامی اخلاق کی پوری پابندی کی جائے۔ قومی' وطنی' نسلی' خاندانی' طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کرکے اصلاً صرف اسلام کے مفاد کو سامنے رکھا جائے۔ ظلم کا جواب عدل اور عفو و درگزر سے' بدی کا جواب نیکی سے' جھوٹ کا جواب سچ سے اور بے اصولی کا جواب اصول پسندی سے دیا جائے کہ یہ سعی و جہد صرف اس مسلک حیات کی تبلیغ و اقامت کے لیے ہے جس پر ساری انسانیت کی فلاح موقوف ہے۔ اور پھر اس سعی و جہد میں حسب ضرورت اپنے عیش و آرام کو خیرباد کہنے' اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے اور

جانی و مالی قربانیاں دینے میں کم از کم اتنی ہی پامردی دکھائی جائے، جتنی کہ لینن اور اسٹالن کے ساتھیوں نے کمیونزم کی اقامت میں، نازیوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضاجوئی میں ابھی پچھلے دنوں دکھائی ہے۔

اگر فکری اور عملی شہادت کا یہ فریضہ انجام دے دیا گیا.......... جو دیا یقیناً جاسکتا ہے.......... تو حق کی ساحرانہ قوت تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعویٰ کی گواہ ہے کہ ایک دن یہ جدوجہد کامیاب ہو کر رہے گی۔ ذہنوں کی گرہیں کھل جائیں گی، دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے، آنکھیں اس کے سامنے فرط عقیدت سے جھک پڑیں گی اور دنیا پھر سے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا○ النصر 2:110 کا روح پرور منظر دیکھ لے گی۔

ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے۔ قدرت نے زمین کو اصل مسکن، حق کا بنایا ہے باطل کا نہیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ جب حق اپنے علمبرداروں کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے اپنے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو باطل کا دیو اسے خالی پاکر اپنا قبضہ جما لیتا ہے۔ کیونکہ اس گھر کے بنانے والے نے اس کے لیے ضابطہ ہی یہ بنایا ہے کہ وہ کبھی بے آباد نہ رہے۔ اس لیے اگر وہ اپنے اصل حقدار سے آباد نہیں رہ جاتا تو ناچار غاصب ہی کے لیے اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری صورت حال ہوتی ہے جسے یہ گھر مجبوراً ہی گوارا کرتا رہتا ہے۔ اس لیے جب بھی اس کا اصل مکین اپنا قبضہ واپس لینے پر تل جاتا ہے تو قدرت کے مضبوط ہاتھ اس غاصب کو نکال کر لازماً باہر کر دیتے ہیں۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں بلکہ قرآن حکیم کے محکم بیان پر ہے۔ اس نے فرمایا ہے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا○ بنی اسرائیل 81:17

حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بلاشبہ باطل مٹنے ہی والی چیز ہے۔

معلوم ہوا کہ باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے۔ جب حق آئے گا.......... آئے گا نہیں بلکہ یوں کہیے کہ جب لانے والے اسے لائیں گے تو باطل خود جگہ

چھوڑ دے گا، اس لیے یہ گمان کرنا کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں دراصل اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا اور عہد شکنی کا بہتان لگانا ہے۔ جو خدا اس باطل کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بنا دیتا ہے جو اسے مبغوض ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر دی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دے گا جو اس کو محبوب ہے حالانکہ اس کی طرف سے وعدے پر وعدے بھی کیے گئے ہیں کہ:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ الحج 40:22

اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ طلاق 4:65

جو خدا ترسی کی روش اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے کام میں اس کے لیے آسانی فراہم کر دیتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ طلاق 2-3:65

جو کوئی خدا ترسی کی راہ چلتا ہے وہ اس کو راستہ مہیا کر دیتا ہے۔ اور اسے وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے روزی ملنے کا سان وگمان بھی نہیں ہوتا' اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی (ثابت) ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اس سعی وجہد کے نتیجے میں اس نے ہمیں یقین دلایا ہے کہ:

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ المائدہ 56:5

سن رکھو! اللہ کی پارٹی ہی غالب رہنے والی ہے۔

نیز اس نے یہ بات بھی فرما رکھی ہے اور کسی اشارے کنائے کے انداز میں نہیں' بلکہ صریح لفظوں میں فرما رکھی ہے کہ جب یہ پارٹی دشمن کے مقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اس کی پشت پر ہوتی ہیں یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے بھی اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لیے اتر آتے ہیں اور اس لیے وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آ کر رہتی ہے۔ بدر' احد' احزاب' اور حنین کی لڑائیوں میں یہ وعدے واقعہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ جو فرشتے ان میدانوں میں آئے تھے وہ کہیں بھی آ سکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے بندے اور حق کے مجاہد جب چاہیں انھیں بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرتے وقت جب اللہ نے ملائکہ کے اترنے کا ذکر کر کے اپنی غیر معمولی

نصرت فرمائی کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی اس خیال کو بھی دور کر دیا کہ ممکن ہے یہ نصرت کوئی وقتی قسم کی اور صرف اسی ایک موقع کے لیے رہی ہو...... فرمایا:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط الانفال 10:8

یہ مدد خاص اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔

فرمانے کا مدعا یہ ہے کہ فتح و نصرت خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گی۔ اس لیے اہل ایمان کو یہ تائید و نصرت ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے اور اگر انھوں نے ''اَنْصَارُ اللّٰه'' ہونے کا حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ بھی ان کا ''مولیٰ'' اور ''نصیر'' بننے میں دیر نہ لگائے گا۔

یاد رکھیے یہ سب وعدے اور ارشادات اس اللہ کے ہیں جس کے بارے میں مومن کا یہ یقین ہے کہ وہ کبھی غلط وعدہ نہیں کرتا اور جو وعدہ کرتا ہے اسے ضرور پورا کرتا ہے اور اگر کوئی اس یقین سے محروم ہے تو وہ مومن ہی نہیں .... جھوٹ کہتا ہے اگر اپنے آپ کو مومن کہتا ہے۔ حتیٰ کہ غلط نہ ہوگا اگر اسے انھی پیش رووں کا ''خلف الصدق'' کہا جائے جو دین کی راہ میں مشکلات کو دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ اللہ ہم سے فتح اور غلبے کے وعدے کر کے دراصل دھوکہ دے رہا ہے۔

مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا O الاحزاب 12:33

کیا ان تمام حقیقتوں کے باوجود دین کے قیام کو ناممکن ہی کہا جاتا رہے گا اور کیا ایسا کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی یا پھر ادائے فرض سے بزدلانہ فرار کی دلیل نہیں؟ امکان کامیابی کے ان تمام روشن پہلوؤں کی موجودگی میں بھی اگر کوئی شخص قیام دین کی طرف سے مایوس ہی رہتا ہے تو یقیناً وہ نہ مومن کا کردار ادا کرتا ہے نہ مومنانہ ذہن کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ بھولتا ہے کہ مایوسی ایمان کے نہیں بلکہ کفر کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے لوگ حالات کی نام نہاد ناسازگاریوں کو دراصل اپنی فراری روش کا جواز ثابت کرنے کے لیے بہانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں ورنہ انھیں بتانا چاہیے کہ آخر وہ کون سے حالات ہیں جن میں دین اللہ کا قیام و نفاذ ممکن ہوا کرتا ہے؟ یہ تو بالکل ظاہر بات ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی کوشش

جہاں بھی اور جس وقت بھی درکار ہوگی وہاں اور اس وقت کوئی نہ کوئی دین باطل بالفعل قائم اور نافذ ضرور ہوگا۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ باطل نظاموں میں سے وہ کون سا نظام ''شریف'' نظام ہے جو نظام حق کے قیام و نفاذ کے لیے اپنی مملکت از خود چھوڑ دیا کرتا ہے تاکہ اس کی آمد کا انتظار کیا جائے اور جب وہ آ کر نظام حق کی تاجپوشی کے لیے دربار حکومت بنا سجا دے تو اس کے ہم ''وفادار'' خدام' تزک و احتشام سے اسے لے جا کر تخت پر بٹھا دیں۔ کیا دنیا کی پوری زندگی میں اس طرح کا کوئی حق نواز باطل کبھی پایا گیا ہے؟ اور کیا دین حق کی اقامت کے لیے جب جب کوششیں کی گئی ہیں اس وقت کے حالات اس کام کے لیے ضرور ہی سازگار تھے؟ اور آئندہ ہمیں بھی ایسے خوش آئند حالات پیدا ہو جانے کی امید ہے؟ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اس کا علم تو خدا ہی کو ہے مگر ماضی کے حالات اور واقعات کے آئینے میں تو صورت واقعہ کا مشاہدہ ہم بھی کر سکتے ہیں۔ ان حالات اور واقعات کا گہری نظر سے جائزہ لیجیے اور پھر بتائیے کہ دینی تاریخ کے اس پورے سلسلے میں' جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ہم تک پہنچتا ہے اقامت دین کے لیے جتنی کوششیں کی جا چکی ہیں کیا ان سب کے زمانے اس کام کے لیے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ اس کے ثبوت میں کیا حضرت نوحؑ کے زمانے کا نام لیا جا سکتا ہے جب کہ ساڑھے نو سو سال تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہی ہوتی رہی تھی؟ یا کیا حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جب کہ نمرود کی ''خدائی'' قائم تھی اور حضرت ممدوح کو آخر کار انگاروں کی بھٹی میں جھونک دیا گیا تھا یا کیا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ اس خیال کی شہادت بن سکتا ہے جس میں چاروں طرف رومن ایمپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی اور چند برسوں کے اندر ہی اندر انھیں پھانسی کا حکم سننا پڑ گیا؟ پھر کیا پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ اس نقطۂ نظر کے حق میں پیش کیا جا سکتا ہے جب کہ خود مرکز توحید تین سو ساٹھ بتوں کا گڑھ اور جاہلیت کی راجدھانی بنا ہوا تھا' اور دعوت حق کا جواب دل آزاریوں اور ایذا رسانیوں' کانٹوں اور پتھروں' سماجی بائی کاٹوں اور قتل کے منصوبوں سے

دیا جارہا تھا......... اگر انبیائی دعوتوں کو کسی تاویل سے اپنے لیے ماورائے مثال قرار دے لیا جائے تو اچھا' ذرا نیچے بھی اتر کر دیکھ لیجیے دیکھیے' یہ مجدد الف ثانیؒ کا زمانۂ دعوت ہے' اس میں ''مسلمان حکومت'' اسلام کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرتی نظر آ رہی ہے اور یہ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا زمانہ ہے جس میں اہل اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار دکھائی دے رہے ہیں اور داڑھیوں تک پر ٹیکس لگا ہوا ہے۔ نام لے کر بتایئے ان زمانوں میں سے کون سا زمانہ ہے جس کو دعوت حق کے لیے موجودہ زمانے سے زیادہ سازگار کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ ان میں سے ہر زمانہ اقامت دین کے لیے اس سے کہیں زیادہ پُرخطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا جتنا کہ آج ہے؟ پس اگر ناسازگاریوں کا لحاظ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغاز آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جدوجہد کے لیے سازگار تھا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے سخت زمانوں اور ناموافق حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہوگئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہاں کی ساری ناکامیاں اسی زمانے کے لیے کیوں مقدر مان لی ہیں؟ اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لیے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

مزید ستم ظریفی یہ کہ ''ناممکن'' ہونے کا یہ فتویٰ بھی کسی عملی تجربے کی سند کے بغیر ہی دیا جارہا ہے۔ جب اس کام کی خاطر کبھی براہ راست کوشش ہم نے کی ہی نہیں تو آخر کس دلیل کی بنا پر یہ ناممکن' ناممکن کا شور کیا جارہا ہے؟ اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ' اور طریق انبیاء کے مطابق' یہ کوشش کرلی ہوتی اور اس کے بعد بھی ساحل مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو بہر حال یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدم امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ عجیب دھاندلی ہے کہ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے اس کی گہرائی کے اتھاہ ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ یقین فرمایئے جو ذہنیت آج کے حالات کو ناسازگار کہتی ہے اور ان کی موجودگی میں کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک

کسی امکان کے پالینے میں ناکام ہی رہے گی۔ اور اس کے لیے کوئی زمانہ ایسا آ ہی نہیں سکتا جس میں اس جدوجہد کو شروع کیا جاسکتا ہو۔ جس باطل سے آج وہ لرزاں ہے وہی ہمیشہ رہے گا۔ صرف اس کی شکلیں بدلتی رہیں گی۔ مگر قیامِ حق کے مقابلے میں ہر باطل باطل ہی ہے، وہ اپنے کسی دور اور اپنی کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا رہنما سمجھنے کا روادار نہیں ہوسکتا اور نہ ٹھنڈے پیٹوں اسے اپنے سامنے پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامت حق کے لیے جدوجہد کی جائے گی وقت کا باطل اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہوکر لازماً سامنے آئے گا اور اہل حق کو مختلف شکلوں میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کے لیے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جاسکتا ہے۔ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ کدوں ہی سے ہوکر گزری ہے اور اب یا آئندہ جب بھی گزرے گی انھیں کانٹوں اور انگاروں میں سے ہوکر گزرے گی۔ وہ امکان اور وہ سازگاری، جس کی تلاش ہے اس راہ کے مسافروں کو نہ کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ غلط فہمی یا خوش گمانی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ وہ بار بار فرما چکا ہے کہ ایمان کو طرح طرح کی آزمائشوں سے جانچا پرکھا جاتا ہے اور اللہ کے حضور وہ اس وقت تک مقبول نہیں ٹھیرتا جب تک کہ وہ اس بھٹی میں تپائے جانے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کردے۔ حتیٰ کہ حالات اگر بظاہر بالکل سازگار اور بے خطر دکھائی دیتے ہوں تو بھی قدرت انھیں ناسازگار اور خطرناک بنا دیا کرتی ہے تاکہ ایمانی دعوؤں کی صداقت جانچی جاسکے۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس منطق کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ حالات سخت ناسازگار ہیں اور فضا خطرات سے بھری ہوئی ہے اس لیے دین کی اقامت کا نام لینا صحیح نہیں.......... قرآن حکیم کے نزدیک تو مشکلات اور مصائب کے ذریعے ادّعائے ایمان کی آزمائش ضروری ہے لیکن اس کے ماننے والوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس آزمائش میں کامیاب ہوکر اپنے مومن ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے بجائے اسے الٹا اپنے ادائے فرض سے سبکدوش ہونے کی سند جواز بنائے لے رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی

ہے کہ فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کردے کہ وہاں سے توپوں کے چھوٹنے اور بموں کے پھٹنے کی دہشت ناک آوازیں آرہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھے یہی جارہا ہو کہ مجھے ملک وملت کا ایک وفادار اور فرض شناس سپاہی کہا جانا اور بہادری کے تمغے کا مستحق تسلیم کیا جانا چاہیے۔ حالانکہ یہ میدان جنگ ہی وہ جگہ ہے جہاں اس اعزاز کا استحقاق حاصل کیا جاسکتا ہے۔

قومی مفاد کا بت

اس سلسلے میں قومی مفادات کی دہائی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کیونکہ اس ''دلیل'' کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ جس مسلمان کو ہر حال میں انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے اور اللہ کے لیے حق کی بے لاگ شہادت دینے کی تعلیم دی گئی تھی خواہ اس شہادت میں اسے خود اپنی ذات کے لیے اپنے والدین ہی کے یا اپنے اقربا ہی کے خلاف صف آرا ہونا پڑ جائے (كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ) اور جس کے متعلق یہ طے کیا جاچکا ہے کہ اللہ نے اس کے جان و مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے (اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی الخ) اب اسی مسلمان کو گویا اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ اگر انصاف کی راہ چلنے اور حق کی شہادت دینے میں تیری ذات کا یا تیرے خاندان کا یا تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو تو ایسے انصاف کو دیوار پر دے مار اور ایسی شہادت حق پر لعنت بھیج! اگر اللہ کی رضا جوئی اختیار کرنے سے تیری جان یا تیرے مال پر آنچ آتی ہو تو ایسی خدا طلبی کو دور سے سلام کر! غور تو کیجیے قومی مفاد کی محبت میں اپنے مقصد وجود ہی کو چھوڑ بیٹھنے کا خیال کوئی معمولی خیال ہے، یا یہ زندگی کا ایک مستقل بنیادی نظریہ ہے جس کی اساس پر بننے والی عمارت اس عمارت سے یکسر مختلف ہوتی ہے جسے اسلام یا قرآن تعمیر کرنا چاہتا ہے؟ اس نظریے کو اختیار کر لینے والا اگر اپنے کو مسلمان کہتا ہے تو کہے مگر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ایک ایسا ''مسلمان'' ہے جس کی نگاہ میں بنیادی اہمیت دین اور قیام دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی اور سیاسی مفاد کو حاصل ہے جو ایسا کوئی راستہ اختیار کر ہی نہیں سکتا جس کا تقاضا اسلام چاہے کیسے ہی شد و مد سے کرتا ہو مگر اس

کے اختیار کرنے سے اس کو اپنایا یا اپنی قوم کا کوئی مادی مفاد خطرے میں پڑتا دکھائی دیتا ہو اور جو دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر رضائے الٰہی کو قومی مفاد پر یعنی مقصد زندگی کو زندگی پر قربان کر دینے ہی کو دانش مندی سمجھتا ہے۔ کیا اس ذہنیت کو مومنانہ ذہنیت سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا یہ وہی انداز فکر ہے جو قرآن اپنے پیروؤں کو سکھاتا ہے؟ اگر یہ ذہنیت اور یہ انداز فکر ایک مومن اور پیرو قرآن کا ہو سکتا ہے تو پھر وہ کون سی ذہنیت اور انداز فکر ہے جسے ہم کفر اور مادیت کا مخصوص انداز کہہ سکتے ہیں؟ کیا ہمیں قرآن کی یہ بات یاد نہیں رہی کہ ''اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں'' (مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ) (الاحزاب 33:4) اور جب ہر شخص کے سینے میں دل ایک ہی ہے تو اس میں بیک وقت دو محبوبوں اور دو ''معبودوں'' کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے۔ اس میں آباد تو صرف ایک ہی کی محبت ہو سکتی ہے، یا تو خدا کی یا قوم اور قومی مفاد کی۔ اس لیے حضرت مسیحؑ کی زبان میں اسی بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ (متی باب ٦)

غرض اس نظریے کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے آسمان کے سورج سے زیادہ روشن، اس لیے جس قسم کے مفاد قومی کی دہائی دی جا رہی ہے وہ ایک خطرناک بت ہے جسے توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ نبوت میں بہت سے منافقوں کے نفاق کی بنیاد بھی اسی مفاد پرستانہ ذہنیت پر تھی، ایمانی اخلاص کے مطالبے کے جواب میں وہ کہا کرتے تھے کہ:

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ المائدہ 52:5

ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت آ جائے گی۔

یعنی اگر ہم اخلاص کے ساتھ اور بالکل یکسو ہو کر ملت اسلامی میں علانیہ شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی۔ ماحول ہمارا دشمن ہو جائے گا اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔

اسی طرح بہت سے تھڑ دلے کفار کا بھی یہی کہنا تھا کہ محمدؐ! ہم تمھاری تعلیمات کی سچائی کا انکار نہیں کرتے مگر ہماری اس مشکل کا کیا علاج کہ:

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ط القصص 57:18

اگر ہم آپ کے ساتھ ہدایت الٰہی کے پیرو بن جائیں تو (مادر) وطن (کی گود) سے اچک لیے جائیں گے۔

یہ دونوں گروہ اتباع حق کے معاملے میں جس انداز فکر اور طرز استدلال سے کام لے رہے تھے کیا آج قومی مفاد کی باتیں انھی کی یاد تازہ نہیں کر رہی ہیں؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبرؐ صادق و مصدوق ہے۔ اسلام کی صحیح پیروی ہی فلاح اور خوش بختی کا واحد ذریعہ ہے.........لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسولؐ کی ہدایات اور اسلام کے تقاضوں پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے! ہمیں اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانے بھر کی آفتیں ہم پر ٹوٹ پڑیں گی! ذرّہ ذرّہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا۔ ہم معاشی غلام اور سیاسی اچھوت بن جائیں گے! افسوس! ذرا نہ سوچا گیا کہ یہ قومی مفاد کا بچانا ہے یا اللہ کے غضب کو دعوت دینا؟

صحیح مفادات کے تحفظ کی قطعی ضمانت

یہ جو کچھ عرض کیا گیا' یہ فرض کر کے عرض کیا گیا کہ قومی مفادات کی تباہی کا اندیشہ ایک واقعی اندیشہ ہے لیکن کیا حقیقت بھی اس مفروضے کے مطابق ہی ہے؟ کیا امت اگر دین کی ہو رہی تو دنیا سے فی الواقع اسے ہاتھ دھو ہی لینا پڑے گا۔ قرآن مجید کا کہنا ہے کہ نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی اقامت دین کا فریضہ اگر بجا لایا گیا تو اس سے صرف آخرت ہی نہیں سنورے گی بلکہ اس کی دنیا بھی اجلی ہو جائے گی اور کسی ایسی چیز سے محروم نہ رہ جائے گی جس کی عالی حوصلہ قومیں طلب گار اور آرزو مند ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ ان محبوب و مطلوب چیزوں میں سے ایک ایک چیز کا نام لے کر ''باایمان'' مومنوں کو اس کے لازمی حصول کی بشارت دیتا ہے مثلاً باعزت امن و اطمینان کی زندگی کے بارے میں جو صحیح قومی مفادات میں سے ایک اہم مفاد ہے۔ وہ فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ الانعام 82:6

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن ہے۔

اسی طرح معاشی خوشحالی کے متعلق وہ اللہ جل شانہٗ کے یہ ارشادات سناتا ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

الاعراف 96:7

اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلے ہوتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ المائدہ 66:5

اگر یہ اہل کتاب تورات اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو جو ان کے رب کی طرف سے ان پر اتاری گئی تھیں قائم کرتے تو اپنے اوپر سے بھی رزق پاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔

سیاسی سربلندی کے بارے میں، جسے غالباً قومی مفادات میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ اللہ رب العزت کی طرف سے یہ قول دیتا ہے کہ:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ الانبیاء 105:21

بے شک زمین کی وراثت میرے صالح بندوں کو ملتی ہے۔

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ آل عمران 139:3

تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان والے ہوئے۔

ان الگ الگ یقین دہانیوں کے علاوہ اس کی ایک جامع یقین دہانی بھی سنیے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ النور 55:24

اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ان لوگوں سے، جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے یہ وعدہ ہے کہ انھیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے معاملے میں وہ ایسا کرتا رہا ہے اور ان کے لیے ان کے اس دین کی جڑیں گہری جما دے گا جسے ان کے لیے اس نے پسند فرمایا

ہے اور ان کے خوف کو امن وسلامتی سے بدل دے گا۔
پھر اسی بات کو منفی شکل میں بھی دیکھیے:

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ط المائدہ 105:5

بھٹکے ہوئے لوگ تمھارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے جب تم سیدھی راہ پر ہو گے۔

قرآن مجید کے یہ سارے وعدے اور اس کی یہ یقین دہانیاں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس خوفِ بربادی کی حقیقت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے جو اقامت دین کا نام سنتے ہی قومی مفاد کے نام نہاد پاسبانوں پر طاری ہو جایا کرتا ہے۔ کیا اب بھی ایمان کش خام خیالی کو کوئی وزن دیا جا سکتا ہے کہ یہ جدوجہد مسلم مفادات کو نگل جائے گی؟ یا اس کے برعکس یہ باور کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ اگر ایمان وعمل صالح کی جرأت مندانہ زندگی اختیار کر کے صحیح معنوں میں یہ فریضہ انجام دیا گیا تو اس کے نتیجے میں ہمیں ہر وہ چیز مل جائے گی اور قطعاً مل جائے گی جسے قوم وملت کا واقعی مفاد کہا جا سکتا ہے۔

لیکن اگر کسی بدنصیب کو خود ایمان کی قوت تسخیر ہی سے بدگمانی ہو اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اسے اعتماد ہی نہ ہو تو بڑی زبردستی کرتا ہے اگر اس کے باوجود بھی وہ امت مسلمہ کے معاملے میں کچھ بولنے کا اپنے کو حق دار سمجھتا ہے۔ بلاشبہ ایسے لوگوں کو کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی خوف اور مایوسی کی دلدل سے نہیں نکال سکتی۔ ان کے نزدیک تو اقامت دین کی جدوجہد کیا، نفسِ اسلام ہی خوف اور تباہی کا سامان ہے۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں عزت واقبال اور امن وخوشحالی کا حصول بڑی دشواریوں اور قربانیوں کے بعد ہی ہوگا اور ابتداء میں ملت کو کچھ نہ کچھ کھونا ضرور پڑے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دشواری کچھ اسی مقصد کی راہ میں نہیں آتی بلکہ یہاں ہر بڑے مقصد کی خاطر اسی طرح کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور جسے کچھ پانا ہوتا ہے وہ پہلے کچھ نہ کچھ کھو ضرور لیتا ہے۔ ایک کسان فصل اٹھانے کے زمانے میں اپنے کھتے اسی وقت بھر سکتا ہے جب کہ تخم ریزی کے زمانے میں اس نے اسے بقدر ضرورت خالی بھی کیا ہو۔ اس لیے قومی مفادات کی اگر فصل کاٹنی ہو تو اس کے لیے پہلے تخم ریزی کا صرفہ اور دیگر

ضروری مشقتیں برداشت کرنی ہی پڑیں گی اور اس حد تک مفادات سے دست برداری کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ یقین بالکل بجا ہے لیکن کیا چند پیسے دے کر اشرفیوں کا توڑا حاصل کر لینا کوئی گھاٹے کا سودا ہے اور کیا اسے مفادات کی تباہی کہا جائے گا' یا ان کے بہتر سے بہتر حصول اور تحفظ کی بہتر سے بہتر ضمانت؟

پھیر کا راستہ

اب رہا یہ سوال کہ آیا ناسازگار حالات کے پیش نظر ہم نصب العین کے لیے براہ راست جدوجہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟ تو اس سوال کا جواب کسی طرح بھی اثبات میں نہیں دیا جاسکتا۔ نہ تو عقل اس کی حمایت کرتی ہے نہ حق کی فطرت اسے گوارا کرنے کو تیار ہے اور نہ اب تک کی تاریخ سے اس بات کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اس مقصد کو صحیح معنوں میں اپنا مقصد زندگی قرار دینے والے کسی شخص یا گروہ نے یہ پالیسی اختیار کی تھی۔ یہ جدوجہد متمدن اور غیر متمدن' آزاد اور غلام' دولت مند اور غریب غرض ہر طرح کی قوموں کے اندر چلتی رہی ہے اور ہر طرح کے حالات میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ مگر ہر ایک نے آتے ہی سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ یہی اور صرف یہی تھی کہ:

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ النحل 16:36

(اے بندگانِ خدا) خدا کی بندگی کرو اور طاغوت سے دور رہو۔

کاوش کے باوجود بھی کسی نبی کو اس راست پالیسی سے ہٹ کر کوئی پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پایا جاسکتا۔ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجیے کہ ان حضرات نے ایسا کیوں کیا؟ پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لیجیے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا ہی ہوا جیسا کہ واقعہ ہے تو پھر ان لوگوں کے لیے جو اسوۂ انبیا ہی کو اپنا مرجع کامل مانتے ہوں، اس طریق کار کو چھوڑ بیٹھنا جائز کس حجتِ شرعی کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالات زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا اس بات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانے تو بالکل

یکساں نوعیت کے تھے جس کی وجہ سے ان سب کے طرز عمل میں ایسی مکمل یکسانی اور ہم رنگی پائی جاتی ہے اور یہی بیسویں صدی کا زمانہ ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات یکا یک اب تک کی پوری انسانی تاریخ کے حالات سے یکسر مختلف ہو گئے ہیں؟ یقیناً کوئی بھی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ کچھ بنیادی حقائق تو ایسے ہیں کہ جو کبھی بدلتے نہیں اور جو تمام زمانوں میں یکساں طور سے کارفرما رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ یہ صرف ظاہری حالات اور عارضی کیفیات ہوتی ہیں جو ہر دور کی الگ الگ ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ اس لیے اگر ظاہری باتوں کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دورِ عیسوی سے اور دورِ عیسوی دورِ موسوی سے بھی لازماً مختلف تھا۔ اب اگر اس اختلاف احوال کے باوجود تمام انبیا نے یکساں طور پر ہمیشہ براہ راست جدوجہد کی پالیسی اختیار کی۔ تو اس ظاہری اختلاف کے باوجود بھی، جو ہمارے زمانے اور پچھلے زمانوں میں نظر آتا ہے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم بھی یہی پالیسی اختیار کریں کیونکہ اس کام کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کبھی اپنایا ہی نہیں گیا اور تمام انبیا کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جدوجہد کا مزاج ہی براہ راست اقدام کا طالب ہے، یہ دلیل یقین سے بڑھ کر ہم کو حق الیقین کی حد تک پہنچا دے سکتی ہے اگر اس میں تاریخ انبیا کی یہ گواہی بھی شامل کر دی جائے کہ بعض انبیاء کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے۔ مگر انھوں نے پوری صفائی اور طمانیت کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ خود سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کی جس پیش کش کا تذکرہ پچھلے صفحوں میں آ چکا ہے غور فرمایئے اس نے اس پالیسی کا کیسا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا؟ جب انھوں نے کہا کہ آپؐ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لیے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپؐ اپنی ''دعوت توحید'' سے دست کش ہو جائیں۔ آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپؐ ہمارے بتوں کی تردید اور تحقیر کرنے اور ہمارے دین کی عیب چینیاں فرمانے سے باز رہیں

..........تو آج کے اہل سیاست وتدبر کے نقطۂ نظر سے یہ پیش کش یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ ہی تھی اور اس کو ٹھکرا دینے کی بابت کچھ سوچنا بھی حرام مطلق سے کم نہ تھا۔ انھیں اگر مشورہ دینے کا موقع ملتا تو ان کا مشورہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ آپؐ اس پیش کش کو فوراً قبول فرمالیں تا کہ اس سے ایک طرف تو ان مصیبتوں اور فتنوں کا بھی خاتمہ ہو جائے جو آپؐ اور آپؐ کے پیروؤں کی زندگی اجیرن کیے ہوئے ہیں دوسری طرف تخت حجاز پر قابض ہو چکنے کے بعد آپؐ اپنے حاکمانہ اثر واقتدار سے کام لیتے ہوئے ''حکمت'' کے ساتھ اپنے دین کی جڑیں مضبوط کرتے جائیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ پورے عرب پر قائم ہو جائے۔ مگر آپ کو معلوم ہے کہ پیغمبر عالمؐ نے اس ''سنہری'' موقع پر کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور اس پیش کش کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ:

ماجئت بما جئتكم به اطلب اموالكم ولا الشرف ولا الملك عليكم فبلغتكم رسالات ربي و نصحت لكم فان تقبلوا مني ماجئتكم به فهو حظكم في الدنيا و الآخرة ان تردوه على اصبر لا مر الله حتى يحكم بيني و بينكم۔ (ابن ہشام۔جلد ا)

میں تمھارے پاس جو پیغام لے کر آیا ہوں اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعے تمھاری دولت حاصل کرلوں یا جاہ وعظمت کا مالک بن جاؤں یا تمھارا بادشاہ بن جاؤں۔ سو میں نے تمھیں اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور تمھاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تم میری دعوت کو مان لیتے ہو تو وہ تمھارے لیے دنیا وآخرت میں باعث خیر ثابت ہوگی اور اگر اسے رد کر دیتے ہو تو میں پوری مضبوطی سے اپنے کام میں لگا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ کر دے۔

یہ کسی جوشیلے اور جذبات کی رو میں بہنے والے انقلابی نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلم حکمت ودانش کے الفاظ تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر خدا کی نگرانی قائم تھی اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات سے بے قابو ہو کر نہیں کہی۔ اس لیے ایک مومن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس پیش کش کا حق نہیں پہچانا اور ایک ایسے طریق کار کے ہاتھ آتے ہوئے بھی اسے عمداً ترک کر دیا، جو حصولِ مقصد کے لیے راست جدوجہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھا۔ یا یہ کہ آپؐ میں نعوذ باللہ آج کے نام نہاد مدبروں جیسی بھی انجام بینی نہ تھی کہ ماحول اور زمانے کے تقاضوں کا اندازہ کر سکتے اور اس کے نتیجے میں اس پالیسی کو اختیار کر لیتے۔ ایسا کوئی گمان بھی مسلمان کے لیے ممکن نہیں۔ اب اگر آپؐ نے موقع ملنے کے باوجود دعوتِ حق اور اقامت دین کا براہ راست طریقہ ترک نہیں کیا تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ پھیر کا راستہ اختیار کرنا کسی اور ''حکمت و دانش'' کے مطابق ہو تو ہو مگر نبویؐ حکمت و دانش کے مطابق ہرگز نہیں ہے۔

خالص عقلی حیثیت سے بھی دیکھیے تو اس طرز فکر اور اس نظریے میں حیلہ جوئیوں، خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھیر کے راستے اختیار کرنے کے معنی یہی تو ہیں کہ ایک زمانے تک حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے، اور جس باطل میں مسلمان گھرا ہوا ہے اس سے نکل کر حق کی طرف بھاگنے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سائے میں جا کھڑا ہو۔ کیونکہ اگر وہ موجودہ باطل کو درہم برہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کرنے کی کوشش کرے گا جو حق نہ ہو تو وہ لازماً باطل ہی ہوگا۔ جس کا رنگ و روغن تو نیا ضرور ہوگا مگر اصل فطرت اس کی بھی بہر حال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اثر ڈال کر اپنے نصب العین کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار بنا لیں گے مگر افسوس ہے کہ دنیائے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ کیونکہ باطل خواہ کوئی قالب اختیار کرے وہ حق کے لیے کبھی سازگار نہیں ہو سکتا اور اگر اس میں حق کے کچھ پیوند آپ بہ ہزار دقت لگا بھی لیں گے تو بھی وہ آپ کے اصل مقصد کے لیے خالص باطل سے کم مضر ثابت نہ ہوگا۔ دور نہ جائیے، اسی ہندوستان میں بہت سی ''اسلامی ریاستیں'' قائم ہیں جن میں کم و بیش وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ آئندہ نظام ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں مگر وہاں اقامت دین کا نام ہی لے کر دیکھیے زندگی عذاب بنے بغیر نہ رہ سکے گی۔ آپ اپنی اس جدوجہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدِ راہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں، مگر آپ شاید

بھولتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے مشن کے متعلق رومی اقتدار بھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم، یا یوں کہیے کہ اس وقت کے ''مسلمانوں'' ہی نے بڑھ کر اس کی مشکیں کس دیں۔ پھر اپنی حال کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی دینی دعوت کا متعلقہ ''اسلامی حکومتوں'' نے کس ''تپاک سے استقبال کیا؟ شیخ جمال الدین افغانی نے ایک ایسی تحریک اٹھائی جو صرف فی الجملہ دینی تحریک تھی، مگر آپ کی انھی موجودہ ''اسلامی'' حکومتوں نے ان کو رہنے کے لیے جگہ دینے تک سے انکار کر دیا اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں یہ آواز اٹھا کر قدر عافیت معلوم کر سکتا[1] ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے دعوتِ قرآنی کے جواب میں حالات کی ''ناسازگاریوں'' سے گھبرا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا تھا۔ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط یونس 15:10 یعنی اس کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا پھر اس میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جن کے بعد وہ ہماری خواہشوں کے ساتھ اور زمانہ و ماحول سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے ہنگامے جیسے آج ہیں کل بھی ویسے ہی رہیں گے، اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں آئندہ بھی ان میں کوئی کمی رونما نہ ہوگی۔ اس لیے اس پالیسی کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ نہ کبھی پھیر کے راستے اختیار کرنے کے اسباب و محرکات ختم ہوں گے نہ اقامت دین کے لیے براہ راست جدوجہد کی کبھی نوبت آسکے گی۔[2]

۱۔ یہ الفاظ اس وقت لکھے گئے تھے جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی بنیاد پر قائم کی جانے والی ''مملکت خداداد پاکستان'' ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ وجود میں آچکنے کے بعد اس کے ناخداؤں نے وہاں کی اسلامی تحریک کے ساتھ جو کچھ کیا اور پھر چاہنے کے باوجود جو کچھ وہ کر نہ سکے وہ سب کے سامنے ہے۔ اسی طرح مصر کی فوجی حکومت نے وہاں کے اسلام پسندوں کے ساتھ جس بربریت کا سلوک کیا وہ اس تلخ حقیقت کی سب سے زیادہ نمایاں اور عبرتناک مثال ہے۔

۲۔ جس وقت یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس وقت تک یہ بات بھی محض ایک قیاس کی حیثیت رکھتی تھی لیکن تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اب تک کی تاریخ اسے بھی ایک حقیقت واقعی ثابت کر چکی ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے جہاندیدہ ارباب دین و سیاست بڑی بزرگانہ شان سے فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت یہاں انگریز اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ پہلے اسے اکھاڑ دو، پھر آزادی کی فضا میں اس کام کو یکسو ہو کر کیا جائے گا۔ مگر آج آزادی کی کھلی فضا میں بھی یہ مبارک زبانیں اس طرح بند ہیں کہ حال تو حال، مستقبل بعید کے بارے میں بھی کوئی کلمۂ تشفی سنانے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔

۳۔ کلی اور ابدی مایوسی

حیرت انگیز حیا کشی

تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے‘ اس کے سوچنے کا جو انداز ہے اور اس کے جو دلائل ہیں‘ وہ سب قریب قریب وہی ہیں جو دوسرے گروہ کی زبانی گزشتہ بحث میں آپ سن چکے ہیں۔ اس لیے انھیں دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ایک حیثیت سے یہ لوگ ان سے مختلف ضرور ہیں اور وہ یہ کہ فرض ناشناسی اور مقصد فراموشی کی جو بیماری وہاں سیاسی دور اندیشی اور زمانے کی مصلحتوں کے پردے میں چھپا دی گئی تھی یہاں وہ صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ ظاہر کردی گئی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی ہم رنگی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ایمانی بے غیرتی کا تصور‘ جو اس صاف گوئی اور جرات اظہار کے پیچھے کام کر رہی ہے دل پر بڑی سخت چوٹ لگاتا ہے۔ اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اتار کر پھینک دیے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنوں نے یہ حیا کشی ہوش اور بیداری کے عالم میں کی ہے اور کتنوں نے غفلت اور بے ہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف تو اقامت دین کی اس اہمیت کو دیکھیے کہ اس کے بغیر مسلمان کا کوئی موقف ہی باقی نہیں رہ جاتا؟ دوسری طرف ان حضرات کا یہ ارشاد سنیے کہ یہ نصب العین ہے تو بالکل برحق مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں، جس مشن کو پیغمبرؐ کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلاسکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا ہے۔ اس ارشاد کا ظاہر یقیناً بڑا عاجزانہ ہے مگر تہہ میں اتر کر دیکھیے تو یہ عاجزانہ نہیں بلکہ باغیانہ نظر آئے گا۔ جب اقامت دین کی جدوجہد سے از خود کنارہ کش ہو کر اور باطل و منکر کے ساتھ عدم تعرض کی پالیسی اختیار کر کے، انسان پیروانِ اسلام کی صفِ پائیں میں بھی جگہ نہیں پاسکتا اور اللہ کے رسولؐ نے ایسے شخص کو ایمان

کے آخری ذرّے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہ بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی بھی اس فرض کی انجام دہی سے بے تعلق ہو جانے کا کوئی حق کیسے دلا سکتی ہے۔ اگر کہیں فی الواقع یہ بے تعلقی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش بھی وہاں بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ''سستا ایڈیشن'' شائع نہیں کیا ہے جس کے تحت اس ''دم خم دکھانے'' سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس قطعی لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان اور رضائے الٰہی کی کوئی مقدار حاصل کی جا سکتی ہے۔[1]

تاریخِ خلافت کا ''استدلال''

اس طرز فکر کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جو ایک نئی ''دلیل'' کی حیثیت بھی رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز صحابہؓ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ پوری طرح قائم نہ رہ سکی اس کے لیے اب کوئی سعی بالکل لاحاصل ہے۔ یہ ''دلیل'' ان معنوں میں یقیناً ایک زبردست دلیل ہے کہ اس کا عام لوگوں کے حوصلوں پر بڑا مرعوب کن اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس خیال نے جتنا موثر پارٹ ادا کیا ہے اس کا اندازہ بھی مشکل ہے لیکن یہ بات کہ یہ ''دلیل'' واقعتاً بھی دلیل ہے اور وہ عام جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ عقل سے بھی اپنا وزن تسلیم کرا سکتی ہے، حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ اس استدلال میں جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فریضے کو اپنے حق میں ساقط سمجھ لیا گیا ہے اس کا اس فریضے کی ادائیگی سے فی الواقع کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ کسی اصول اور نصب العین پر جب آپ ایمان لا چکے تو اس کے مطالبات آپ کو بہرحال پورے کرنے پڑیں گے۔ اور اس بات کا آپ کی ذمہ داری پر ہرگز کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ اسے کبھی ایک لمبے عرصے تک نافذ العمل نہیں رکھا جا سکا ہے۔ اور اگر اس بنیاد پر کسی نے اپنی ذمہ داری کو

---

[1] اس موقع پر ''کامیابی کا اسلامی تصور'' اور ''مومن کی اصل ذمہ داری'' وغیرہ بحثوں کو جو پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی گفت گو سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔

ادا کرنا چھوڑ دیا تو یہ اس کے قول و عمل کے تضاد کی ایک بدترین مثال ہو گی۔ سوچنا چاہیے کہ ہم نے اسلام کی علم برداری آیا اس لیے قبول کر رکھی ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے' یا اس کا کوئی اور سبب ہے؟ اگر کوئی اور سبب ہے تو پھر ہم پر دینی اور اُخروی' جہت سے اس کا کوئی مطالبہ واجب ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہم پر اس کے لیے کسی جدوجہد کے ترک کر بیٹھنے کا الزام لگ سکتا ہے لیکن اگر پہلی بات ہے' جیسا کہ ایک مسلمان کے بارے میں توقع کی جانی چاہیے تو ایک غیر مسلم بھی تاریخ خلافت کی آڑ لینے میں ہمیں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا۔ تیس اور چالیس برس تو درکنار' اگر یہ نظام اپنی اصل اور معیاری شکل میں کامیابی کے ساتھ کبھی ایک دن بھی قائم نہ رہ سکا ہوتا تو بھی اس کے قائم کرنے کی ہماری ذمہ داری اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہی رہتی اور اس کے لیے سر دھڑ کی بازی بہر حال لگانی ہی پڑتی۔ جب ہم نے اس کو حق مانا اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے تو ہمارے لیے یہ دیکھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا گیا؟ اب ہمارے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر ہم نے قبول کر رکھا ہے' تاریخ نہیں کرے گی۔

غالباً اس نام نہاد دلیل کے قریب ترین منطقی نتائج پر بھی غور نہیں کیا گیا۔ ورنہ اتنی غلط بات منہ سے نہ نکالی جاتی۔ اگر اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں اس طرح کے صغریٰ کبریٰ سے کام لینا صحیح ہے تو آیئے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ یہ منطق ہمیں کہاں پہنچا دیتی ہے؟ آپ نے پڑھا ہو گا کہ کتاب و سنت میں ایک مثالی مومن کی فلاں فلاں صفات بیان ہوئی ہیں اور یہ کہ اللہ و رسولؐ نے معیاری ایمان و اسلام کا بڑا اونچا تصور پیش کیا ہے اتنا اونچا تصور کہ اس پر پورے اترنے والے انسان حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت صہیب رومیؓ حضرت بلال حبشیؓ اور انھی کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے اور اس وقت تو اس معیار کا مسلمان شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔ تو اب ذرا اسی منطق سے' جس نے خلافت راشدہ کے مثالی اور معیاری دور کا حوالہ دے کر ہم کو اقامت

دین کی جد و جہد سے دور ہی رہنے کی ''ہدایت'' کی ہے، معیاری مسلمان بننے کی خواہش اور کوشش بلکہ مطلقاً مسلمان ہی باقی رہنے کی بابت بھی فتویٰ پوچھیے۔ اسے یقیناً فتویٰ یہی دینا پڑے گا کہ اب ایسے معیاری ایمان کا ذکر اور خیال چھوڑ دینا چاہئے اور ان مطلوبہ مثالی صفات کے لیے کوشش بند کر دینا چاہیے حتیٰ کہ مسلمان باقی رہنے کی خواہش بھی غلط ہوگی کیونکہ یہ سب کچھ تم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام ہی نہیں ہے ظاہر ہے کہ اگر آپ پہلے استدلال کو غلط نہیں سمجھتے تو اس دوسرے استدلال کو بھی رد نہیں کر سکتے۔ اگر خلافت راشدہ کی قلیل العمری اجتماعی اور سیاسی پہلو سے ہمیں اس امر کا حق دلا سکتی ہے کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تدیُّن و تقویٰ کے سلسلے میں اس ''استحقاق معذرت'' کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن عجیب ماجرا ہے کہ اگرچہ اب ایک ''ابوبکرؓ'' بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے مگر ایک شخص بھی صدیقی اور فاروقی ایمان کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر' یا معیاری ایمان کی خواہش اور کوشش سے دست برداری پر تیار نہیں۔ اس کے بخلاف ہو یہ رہا ہے کہ خود کو بھی اوپر اٹھانے کی کوششیں جاری ہیں اور دوسروں کو بھی اچھا مسلمان بنانے کے لیے تبلیغی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں۔ اشاعت دین کے ادارے کھولے جاتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لیے درسگاہیں جاری کی جاتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ صدیقؓ و فاروقؓ کی سی اسلامیت کے حصول سے مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ اس کے جواب میں آخر یہی تو کہا جائے گا نا کہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ اسلام کے اعلیٰ اور مثالی نمونے تھے۔ ان کے جیسا ایمان و تقویٰ اگر ہم اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی چھوڑ دیں بلکہ ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان نمونوں کو سامنے رکھ کر اپنی استطاعت کے مطابق پوری کوشش کریں اور جہاں تک ہو سکے اسی طرح کا تدیُّن پیدا کرنے کی فکر میں برابر لگے رہیں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ وہ ہمارے لیے معیار اور مثال کا کام دیں اور ہم میں سے

جسے جتنی توفیق ملے اپنے آپ کو ان کا ہم رنگ بنانے کی کوششیں کرتا رہے اور جس مقام پر وہ تھے اس کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ سوال یہ ہے کہ یہی بات اقامت دین کے سلسلے میں بھی کیوں نہیں سوچی اور کہی جاتی! اس اصولی بات کو ایمان و عمل کے ایک محدود دائرے ہی تک کیوں محدود کر لیا جاتا ہے۔ اس کے اطلاق کو کیوں نہیں وسیع تر مسائل تک پھیلنے دیا جاتا؟ یقیناً اس تحدید کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس اصولی نقطۂ نگاہ سے آپ خلافت راشدہ سے تعلق رکھنے والی اس بحث کو بھی دیکھیں۔ حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرز خلافت بھی ایک معیاری اور مثالی طرز کا تھا۔ اس طرز کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینے میں پوری طرح محفوظ کر دیا ہے تاکہ دین کے علمبرداروں کے لیے وہ ہمیشہ ایک اعلیٰ معیار اور مثالی نمونے کا کام دیتا رہے اور جس حد تک ان کے دست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونے کے اتباع میں برابر کوشاں رہیں اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ ان کا قائم کیا ہوا نظام اس نمونے کا عکس نہ بن جائے، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ ان پاکان خاص کا ایمان و تقویٰ انفرادی زندگیوں میں ہمارے لیے ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جسے سامنے رکھ کر ہمیں اپنے ایمان و تقویٰ کو مسلسل فروغ دینے کی پوری پوری کوشش کرنا ضروری ہے۔ اس سعی و کوشش میں جس حد تک کامیابی ہو جاتی ہے اسی حد تک ہم مکلف اور مسئول بھی ہیں اور اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں جس حد تک بھی ہم قائم کر سکتے ہیں اسے دین اللہ کا قیام ہی کہا جائے گا۔ جس طرح ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کامل نمونوں کو سامنے رکھ کر حتی الامکان ان سے بیش از بیش مماثلت پیدا کرنا ہی ہمارا فریضہ ہے اسی طرح ہر حال میں انھی جیسی معیاری خلافت کا قائم کر دینا ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ ہماری اصل ذمے داری صرف یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کی ہوئی خلافتوں سے زیادہ سے زیادہ مشابہت رکھنے والا اجتماعی نظام قائم کرنے کی پوری سعی کریں، اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے

رنگ کو اور زیادہ نکھارتے رہنے کی کوشش کرتی رہیں۔

اس لیے اس تیس سالہ دور خلافت کو اپنے لیے مثال اور اسوہ بنایئے اور اس کی بلندیوں سے دہشت کھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے بجائے اس سے درس عمل لیجیے۔ انسانیت کا یہ دور سعادت اقامت دین کی جدوجہد پر ابھارنے والی چیز ہے نہ کہ اس سے بددل کرنے والی۔ حیف ہے اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش، اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر مسلمان کا یقین ہے کہ انسانیت کی فلاح صرف دین حق کے قیام ہی سے وابستہ ہے اور اگر اس کا سینہ اس مبارک زمانے کی سچی قدر و محبت سے خالی نہیں ہو گیا ہے جس میں خدا کی مرضی زمین پر بھی اسی طرح پوری ہو رہی تھی جس طرح کہ آسمان پر پوری ہوتی رہتی ہے تو اس یقین اور اس قدر و محبت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ دل اس گزری ہوئی خوشگوار حقیقت کو واقعات کی دنیا میں پھر سے کارفرما دیکھنے کے لیے مسلسل بے قرار رہے جس شخص کے ایمان میں یہ بے قرار روح نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں بلکہ ٹھنڈے تصورات کا ایک بُت کدہ ہے۔

اسلامی نظام کے متعلق ایک شدید غلط فہمی

اوپر کی سطروں میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے فی نفسہٖ یہ خیال ہی غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام صرف تیس سال قائم رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب و غریب خیال کچھ ٹھوس علمی اور تاریخی حقائق سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اسے بالقصد پیدا کیا گیا ہے۔ اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ امر واقعہ صرف یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوئے اور برابر ہوتے رہے اس طرح ان کی خلافتوں کے بعد بھی مدتوں اسلامی نظام قائم رہا فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان حضرات کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی خیر کامل کا نمونہ تھیں اور جس طرح بعد میں آنے والی شخصیتیں ناقص تھیں اسی طرح ان کے وقت کا طرز خلافت بھی ناقص تھا۔ شخصیتوں کا ناقص ہونا اگر کسی

حال میں بھی ان کے غیر مسلم ہونے کے ہم معنی نہیں تو اس طرز خلافت کے ناقص ہونے کے معنی بھی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہ خلافتیں غیر دینی اور ان کا زیر عمل نظام غیر اسلامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ جس طرح مسلم افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح کتاب وسنت کو اصل ماخذ قانون تسلیم کر کے چلائے جانے والے سیاسی نظاموں کے بھی مدارج مختلف ہوتے ہیں۔ جس طرح اشخاص میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ خود اس تیس سالہ خلافت راشدہ کے سب دور بھی اپنی روح میں یکساں نہ تھے۔ بلکہ عثمانی اور علوی خلافتیں صدیقی اور فاروقی خلافتوں سے کم معیاری تھیں جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔ اس لیے جب ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تو اس تیس سالہ دور خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی ڈھانچوں پر بھی سخت سے سخت تنقید تو کی جاسکتی ہے اور ان کو جاہلیت کے عناصر سے مخلوط بھی کہا جاسکتا ہے، مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر انھیں بالکلیہ غیر اسلامی اور جاہلی قرار دے دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق بدعمل مسلمانوں کی ہدایت وتذکیر کا فرض ادا کرتے آئے ہیں اسی طرح وہ ان ناقص حکمرانوں کی غلط کاریوں پر ضرور ٹوکتے رہے اور ان کے طرز حکومت کے نقائص پر اظہار نکیر کرتے ہوئے ان کی اصلاح کی برابر کوششیں کرتے رہے ہیں مگر اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے ان کے خلاف یہ فتویٰ کبھی صادر نہیں کیا کہ یہ حکومتیں سراسر غیر اسلامی اور کافرانہ ہیں۔ غرض خلافت راشدہ کے بعد بھی مدتوں جو سیاسی نظام اسلامی ممالک میں جاری رہے وہ کم وبیش اسلامی ہی تھے۔ عدالتیں اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرتی تھیں۔ سزائیں احکام شریعت کے تحت دی جاتی تھیں۔ جائدادیں دینی ضوابط کی رُو سے تقسیم کی جاتی تھیں۔ مختصر یہ کہ جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کے طرز انتخاب میں اور ان کی ذات میں تھی ورنہ جہاں تک زندگی کے عام معاملات کا تعلق ہے اتھارٹی کتاب وسنت ہی کو حاصل تھی اور اس کے گوشے گوشے پر نظام دین کی بالادستی بدستور چھائی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ خراب سے خراب حکمران بھی

اپنی کوئی غیر اسلامی کارروائی انجام دینے کے لیے اس بات پر مجبور تھا کہ چہرے پر تشرع کی نقاب ڈال لے اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کرسکتا تھا کہ خدا کے دین اور قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دے۔

غلط فہمی نہ ہو، اس تقریر کا منشا یہ نہیں ہے کہ ان تمام حکومتوں کو خالص اسلامی حکومت قرار دے دیا جائے، جو خلافت راشدہ کے بعد قائم ہوتی رہی ہیں اور نہ اقامت دین کا فریضہ یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون رشید کی طرح کوئی نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت دی جارہی اور اس پر مطمئن ہوجانے کی تلقین کی جارہی ہے۔ بلکہ اس کا منشا صرف یہ بتانا ہے کہ خلافت راشدہ کا دور ختم ہوجانے کے بعد بھی اللہ کا دین ایک لمبی مدت تک دنیا میں قائم و نافذ رہا۔ اگرچہ جس انداز میں وہ قائم و نافذ تھا وہ اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی مگر ان تمام نقائص کے باوجود اس کے بحیثیت ایک اسلامی نظام کے قائم و نافذ رہنے کی نفی ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ یہ نظام صرف چند دنوں قائم رہا ایک علمی بددیانتی اور تاریخ سے بہت بڑی فریب کاری ہے۔ اس کا مقصد یا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ اسلام اور اسلامی نظام سے لوگوں میں بدگمانی پیدا کردی جائے۔

اسلامی نظام سب سے زیادہ عملی نظام

جو لوگ خلافت راشدہ کو دوسرے لفظوں میں اسلامی نظام کے معیاری قیام و نفاذ کی، قلیل العمری کو اس بات کی دلیل بناتے ہیں کہ اپنی داخلی نوعیت ہی کے اعتبار سے اب ایک ناممکن العمل نظام ہے انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اسلام کے مقابلے میں وہ کون سا نظام ہے جو اپنے نظریاتی معیار کے مطابق اس سے زیادہ مدت تک قائم اور نافذ رہ سکا ہے؟ اگر وہ بتانا بھی چاہیں گے تو شاہی یا آمریت کا نام تو بہرحال نہ لیں گے کیونکہ یہ دراصل نظام ہی نہیں ہیں اور اگر وہ نظام ہیں بھی تو ایسے نظام ہیں جن کی بنیاد جنگل کے آئین پر ہوتی ہے اور جس کو پوری انسانیت متفقہ طور سے رد کرچکی ہے۔ اس لیے لے دے کر وہ صرف جمہوری اور

اشتراکی نظاموں کا نام لے سکتے ہیں جن کا کہ آج پوری دنیا پر سکہ چل رہا ہے اور جن کی مدح ومنقبت میں اپنے اپنے کیمپ سے بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن ہمیں نہیں معلوم کہ آج تک ان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ وہ کبھی، تیس سال نہیں، تیس مہینے، بلکہ تیس دن بھی اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ کیے جاسکے ہیں۔ اس کے بخلاف تاریخ وسیاست کا پورا لٹریچر اس بات کے اعتراف سے بھرا پڑا ہے کہ جمہوریت ہو یا اشتراکیت کوئی بھی عملاً اپنے نظریاتی معیار تک نہیں پہنچ سکی ہے اور کتابوں میں درج نظریات واقعات کی دنیا میں اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔

جمہوریت کے بارے میں مشہور مفکر برنارڈ شا کہتا ہے کہ:

اس مقصد کے حصول میں ایک ایسی مشکل حائل ہے جو تقریباً ناقابل حل ہے اور وہ یہ خوش فہمی ہے کہ ہر فرد کو ووٹ دینے کا حق مل جانا جمہوریت کی کامیابی کی ضمانت ہے حالانکہ یہی وہ چیز ہے جس سے جمہوریت کے مقاصد قطعی طور پر فوت ہو جاتے ہیں۔ بالغ رائے دہندگی کا اصول جمہوریت کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ پڑھے لکھے اور اونچی فکر رکھنے والے لوگ جمہوریت چاہتے ہیں لیکن پولنگ اسٹیشنوں پر ان کی حیثیت ایک معمولی اقلیت کی ہوتی ہے۔

اطالوی مدبّر میزینی لکھتا ہے کہ:

انسان بادشاہ کی شکل میں ایک ہو یا جمہوریت کی شکل میں زیادہ ہوں بات یکساں ہی رہے گی۔

ڈین رنج صاف کہتا ہے کہ:

ایک مکمل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہوسکتی جس حد تک نظریۂ جمہوریت اسے جمہوری بتاتا ہے۔

لارڈ برانس اور جمہوریت کے دوسرے بہت سے حامیوں نے اپنے کو اس اعتراف پر مجبور پایا ہے کہ:

حقیقی جمہوریت کبھی بھی، اور دنیا کے کسی گوشے میں بھی معرض وجود میں نہیں آسکی ہے۔

رہی اشتراکیت، تو اس کا مقدمہ جمہوریت سے بھی زیادہ کمزور ہے حتیٰ کہ جو نکتہ اس وقت گفتگو کا موضوع ہے اس کی بحث میں وہ کسی ذکر کے قابل ہی نہیں ہے یہ مخالفانہ

پروپیگنڈے کی بات نہیں ہے بلکہ ایک تسلیم شدہ اور بدیہی حقیقت کا اظہار ہے۔ چنانچہ اگر وہ غرض و غایت سن لی جائے جو اس اشتراکیت کے پیش نظر ہے تو یہ حقیقت سورج کی طرح خود عیاں ہو جائے گی۔ اشتراکیت کے مشہور و مستند امام فریڈرک اینجلز کے بیان کے مطابق اشتراکی نظام کی غایت مقصود یہ ہے:

ایک ایسے سماج کی تشکیل جس میں نہ مختلف طبقات ہوں گے نہ انفرادی بقاء کے لیے کش مکش ہوگی۔ انسان فطرت کا باشعور آقا ہوگا۔ اپنی تاریخ خود بنائے گا۔ مجلسی اسباب اس کی اپنی مرضی کے مطابق نتائج پیدا کریں گے۔ وہ احتیاج کی دنیا سے نکل کر اختیار کی دنیا میں داخل ہو چکا ہوگا اور ریاست وحکومت ماضی کی یادگاریں بن چکی ہوں گی۔ (سوشلزم)

آج اشتراکیت کو اقتدار حاصل کیے ہوئے تقریباً چالیس سال ہو چکے ہیں اور اس وقت وہ متعدد ملکوں میں دادِ حکمرانی دے رہی ہے مگر کیا کہیں بھی یہ نظریاتی سماج دکھائی دے رہا ہے؟ روس اس کا سب سے پہلا گہوارہ اور مضبوط قلعہ ہے مگر کیا کبھی کسی کی زبان سے یہ دعویٰ سنا گیا ہے کہ وہاں نہ طبقات ہیں نہ احتجاج ہے، نہ ریاست ہے نہ حکومت ہے۔ اور ہر شخص اپنی تاریخ خود بنا رہا ہے! ظاہر ہے کہ جب وہاں یہ سب چیزیں موجود نہیں ہیں تو ایسا پہاڑ جیسا جھوٹ کون بول سکتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیت کے سارے حامیوں کا کہنا ہے کہ ابھی یہ نظام اپنے عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اور ارتقاء و تغیر کے متعدد مرحلے طے کر چکنے کے بعد اپنے اس نظریاتی معیار تک پہنچے گا۔ یہ بات کہ اشتراکی نظام آئندہ چل کر کبھی اپنے دعوے اور وعدے کے مطابق ایسا سماج پیدا کر بھی سکے گا؟ اس وقت خارج از بحث ہے۔ اس وقت تو دکھانا صرف یہ تھا کہ اشتراکیت ابھی تک، ایک دن کے لیے بھی اپنی معیاری شکل میں کہیں قائم اور نافذ نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بات واقعات کو بھی تسلیم ہے اور اشتراکیت کے ایک ایک حامی اور علمبردار کو بھی۔

دوسرے نظاموں کے اس جائزے سے صورت واقعہ کیا قرار پائی؟ یہی نا کہ دنیا کے قابل ذکر نظاموں میں سے اگر کوئی نظام اپنے معیاری رنگ میں قائم اور نافذ ہو سکا ہے تو وہ صرف اسلامی نظام ہے۔ اس کے سوا دنیا کسی دوسرے ایسے نظام سے واقف نہیں جو تھوڑی

مدت کے لیے بھی اپنا مثالی کردار پیش کر سکا ہو۔ اس لیے اگر کسی نظام کا معیاری قیام و نفاذ ہی اس کے قابل قبول ہونے کی دلیل ہے تو یہ دلیل صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کی اس امتیازی حیثیت کو کوئی اور نظام چیلنج نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بھی کتنی عجیب بات ہوگی کہ اسلامی نظام کا قیام چونکہ بہت تھوڑے دنوں رہ سکا تھا اس لیے اب اسے دوبارہ قائم کرنے کی جدوجہد ایک فضول جدوجہد ہوگی۔

۴۔ تَرَبُّص کا رویہّ

اب ان حضرات کے افکار کا جائزہ لیجیے جو تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثابت قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں اور اسی کام کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ کہنے کے باوجود میدان عمل میں اس لیے نہیں اترتے کہ پہلے سے میدان میں اترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔

نفاق زدہ ذہنیت

اس انداز فکر کی لغویت پر عقل حیران ہے کہ کیا کہے؟ ایک چیز کو تسلیم تو فرض عین کیا جا رہا ہے مگر ساتھ ہی اس سے عملی تعلق کا یہ حال ہے کہ جب تک دوسرے اس کا حق ادا کر کے دکھا نہ دیں ہم اس کے لیے اپنی جگہ سے جنبش نہ کریں گے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ اگر امام ان لوگوں کے خیال کے مطابق صالح اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف یہ کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز ہی چھوڑ بیٹھیں گے اور اپنے خیال میں کل حشر کی عدالت میں یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرض عین ہی سمجھتے تھے اور چوبیس گھنٹے اس کے لیے باوضو رہتے تھے مگر موذن کی اذانوں اور امام کی نمازوں میں ہم کو خلوص وللّٰہیت کی روح نظر نہیں آتی تھی۔ اس لیے ہم نے نماز نہیں پڑھی! کیا غور و فکر کے باوجود بھی اس طرز فکر و استدلال کے لیے کوئی شرعی یا عقلی بنیاد فراہم کی جا سکتی ہے؟ فرض کیجیے کہ زید اقامت دین کی دعوت

دے رہا ہے اور ہماری فرض نا شناسیوں پر جھنجھوڑ کر ہمارا فرض زندگی ہمیں یاد دلا رہا ہے نیز اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور عزیمت کا تعلق ہے آپ کو اس پر پورا اطمینان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اور اس کے سارے ہم سفر آپ کو نااہل، بےعمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی پڑتے ہیں.........تو سوال یہ ہے کہ ان کی یہ ساری خامیاں آپ کے اپنے فرض کو ساقط، اور آپ کو اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش کس طرح کرا دیں گی؟ کیا آپ نے اس امر کو حق اس لیے مانا تھا کہ زید اور اس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے دین حق کی اقامت کو اپنی زندگی کا اصل فریضہ اس شرط کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ پہلے زید اور اس کے ہمراہی ٹھیک ٹھیک ادائے فرض کا عملی ثبوت دے لیں۔ تب ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اٹھیں گے اور اپنی آرام گاہوں سے قدم باہر نکالیں گے؟ کیا قرآن کی مرکزی دعوت پر لبیک کہنے کے آپ اسی طرح مکلف ہیں جب دوسروں کو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں۔ اگر ایسا نہیں ہے.........اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے.........تو خود اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے! دوسرے اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے روبرو اس کے جواب دہ وہ خود ہوں گے آپ اس کھود کرید کی زحمت' کہ کس کے اندر کیا ہے بلاوجہ کیوں اٹھائیں؟ ہر شخص کو صرف اپنے نامۂ اعمال کی فکر کرنی چاہیے۔ دوسروں کی ناقابل اطمینان حالت پر اگر نظر جائے تو صرف درسِ عبرت کے لیے کہ حکمت و دانش کا یہی تقاضا ہے۔ حضرت لقمان سے پوچھا گیا کہ ''آپ نے ادب کس سے سیکھا؟'' جواب دیا کہ ''بے ادبوں سے''۔ مومن کو بھی اللہ تعالیٰ حکیم دیکھنا چاہتا ہے اور ایسی ہی عبرت پذیر اور حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی اس نے اسے تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے مغضوب اور گمراہ قوموں کے تفصیلی تذکروں سے اسی لیے تو بھر رکھا ہے کہ مسلمان ان کی جیسی فکری اور عملی غلط کاریوں سے اچھی طرح باخبر ہو رہیں (وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ○ الانعام 55:6) اور ان سے ہمیشہ بچتے

رہیں۔ اس لیے اس صورت حال کا مطالبہ کہ اقامت دین کا داعی شخص یا گروہ نااہلی کا مظاہرہ کررہا ہے ہم سے اگر کچھ ہوسکتا ہے تو صرف یہی کہ ان کی خامیوں' ظاہر داریوں اور غلط کاریوں کو اپنے لیے بے عملی کی سند بنالینے کے بجائے ان سے خود اپنے دامن کو بچائیں اور پوری للّٰہیت اور عزیمت کے ساتھ اس جھنڈے کو لے کر آگے بڑھیں۔ اس کے سوا اگر کوئی اور صحیح بات ہوسکتی ہے تو صرف یہ کہ ان کے لیے ہدایت' عزیمت' خلوص اور توفیق عمل کی دعا کرتے جائیں کہ ان کی چیخ و پکار اگرچہ ان کی اپنی حد تک محض ''زبانی نعرہ اور بے جان دعویٰ'' تھی مگر ہمارے آپ کے حق میں تو وہی ہادی اور مذکر ثابت ہوئی۔ اس لیے فی الواقع وہ تو ہمارے اور آپ کے شکریئے کے مستحق ہیں نہ کہ کسی طنز یا مخالفت کے۔ اس نادان اور بدنصیب انسان پر جو تاریکیوں کے ہجوم میں سرراہ چراغ لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزل مقصود دکھارہا ہو مگر خود اپنی آنکھوں پر اس نے پٹی باندھ رکھی ہو آپ کو افسوس تو ضرور آنا چاہیے مگر اس پر بے دردانہ اعتراضات کرتے رہنا بے انصافی ہے اور اس کی پیروی کرتے ہوئے چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت اور بدبختی ہے۔ خوش بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے۔ اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو دیکھا جائے پس اقامت حق کی پکار سن کر اللہ کے ان بامراد بندوں کا سارویہ اختیار کیجیے جو اللہ کی باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور پھر ان بہترین باتوں کی پیروی میں لگ جاتے ہیں (اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ)(الزمر 39:18) دعوت اقامت دین کے بارے میں اس طرح کی کوئی بحث تو ہے نہیں کہ وہ ''القول'' اللہ کا قول ہے یا نہیں؟ کیونکہ وہ مسلمہ طور پر ''القول'' ہے، اس لیے بلا تامل اور بغیر توقف اس پر لبیک کہیے اور اگر ساری دنیا بھی اس کے اپنانے سے جی چرا رہی ہو تو بھی یقین رکھیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمے داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے اخلاص وعزیمت کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو جان پہچان لینے کے بعد بھی انتظار کی

پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کی قدر ہی نہیں پہچانتا' اور اک گونہ اس کی راہ بھی روکتا ہے۔

بہت ضروری ہے کہ اس موقع پر اس رُسوائے عالم گروہ کا حال اور انجام یاد کرلیا جائے جس نے رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی جاں فروشانہ دعوتی سرگرمیوں کے معاملے میں یہی پالیسی اختیار کررکھی تھی۔ اور جس کے لیے اس مہم میں شریک ہوجانے کے سلسلے میں یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس کام کے لیے اپنی جانیں کھپا رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی حق تسلیم کررکھا ہے' بلکہ جو حق و باطل کی اس کش مکش سے دور کھڑے اس کے انجام کا اندازہ لگاتے رہتے تھے اور مسلمانوں کی جماعت میں صرف اس وقت آ ملتے تھے۔ جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے:

الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ

النساء4:141

یہ لوگ تمھارے سلسلے میں انتظار کرتے رہتے ہیں، اگر تمھیں اللہ کی طرف سے فتح مل جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہیں تھے؟

غور فرمایئے کہ جو لوگ اقامت دین کو اپنا منصبی فریضہ سمجھتے ہوئے بھی محض دوسروں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کی خاطر آمادۂ عمل نہیں ہوتے۔ ان کی ذہنیت کتنی قریبی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت سے جس پر ان منافقوں کے طرز عمل کی بنیاد تھی؟ جس طرح وہ ''منافق'' حق کی حمایت حق کی خاطر نہیں کرتے تھے اسی طرح ان ''مسلمانوں'' کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگیِ عمل کے لیے کافی نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے اور یہ حضرات اقامت دین کے داعیوں کے عزم و اخلاص کے بارے میں کسی ''شرح صدر'' کے منتظر ہیں! لیکن اتباعِ حق اور ادائے فرض سے بھاگنے میں دونوں مشترک ہیں۔

ایک قدم اور آگے

کاش بات یہیں تک رہتی اور انتظار و تربص کے صرف اسی پہلو پر ہی اکتفا کرلیا گیا

ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ لوگ اسی حد پر رکے رہنے کے لیے تیار نہیں بلکہ خدا پرستی اتباع قرآنی اور عشق محمدیؐ کی دعوے دار اُمت میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جنھیں انتظار اس بات کا ہے کہ اقامت دین کے ''جھوٹے مدعی'' میدان سے کب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور انھیں اپنے جذبات طعن و تشنیع کی تسکین دہی کا موقع کب نصیب ہوتا ہے۔ یہ حضرات ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ یہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک ٹولا ہے جو ''قیام دین''، ''قیام دین'' کا شور مچا رہا ہے۔ زمانے کے حوادث خود ہی اس کی فاتحہ پڑھ دیں گے۔ اور یہ فرما کر گویا اپنی ذمے داریوں کا حق ادا کر دیتے ہیں لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشتر طعن کی زد خود ان کی اپنی رگ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل اب قیام دین کی مسرتوں سے بھی اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لیے کہاں سے دل و دماغ لائے جائیں کہ جو سینہ دین حق کی محبت اور فدویت کا امین بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جارہی ہے جو صرف کفر اور فروغِ کفر کے خلاف مخصوص ہونی چاہیے تھی۔ حالانکہ اگر کسی کے اندر اتنی غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ کرنے کے لیے قدم اٹھا سکے تو اس کے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ اس تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحے کے لیے بھی خالی نہ ہونے دیتا۔ اور اگر اللہ کے کچھ بندے اس کے لیے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے اخلاصِ عمل، ثباتِ قدم، نصرتِ حق اور حسنِ انجام کی دعائیں ہی کرتا رہتا۔ لیکن اگر کوئی اتنا بھی نہیں کر سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرت حق کی آخری چنگاری بھی اس کے اندر بجھ رہی ہے اور اگر خدانخواستہ اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ اس دعوت حق کو فتنہ قرار دے بیٹھے۔ لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے لگ جائے اور اس کے لیے حوادث روزگار کی تمنائیں کرنے لگے، تو اس کی بدبختی کی یہ انتہا ہو گی اور ایسی صورت میں اس کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم آنی چاہیے کیونکہ اس وقت وہ ذہنیت اور طرز اظہار کے تھوڑے سے

اختلاف کے ساتھ بالکل اسی مقام پر ہوگا جہاں سے کبھی کچھ بدنصیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اولوالعزم ساتھیوں کے بارے میں ہلاکتوں کی راہ تکا کرتے تھے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَائِرَ ط التوبہ 9:98

اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو (اللہ کی راہ میں) کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اسے تاوان سمجھتے ہیں اور تم مسلمانوں کے حق میں آفات زمانہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

یا پھر اس مقام پر جہاں سے پیغمبر عالمؐ کی دلوں کو جیت لینے والی دعوت حق کو یہ کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ:

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ طور 52:30

یہ ایک شاعر ہے ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

لہٰذا جنھیں اللہ نے عقل دی ہے اور عقل کے ساتھ ایمان کی تھوڑی سی محبت بھی عطا کی ہے تو وہ اس خطرناک اور ایمان سوز ذہنیت کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔

۵۔ مہدیِ مَوعُود کا انتظار

آخری گروہ ان لوگوں کا ہے جو امام مہدی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے کی خبر دی تھی، چنانچہ وہ اس مدت پر ختم بھی ہوگئی۔ دوسری طرف حضورؐ یہ بھی بشارت سنا گئے ہیں کہ جب دنیا اپنی زندگی کے دن پورے کر چکنے کو ہوگی تو ایک مرد صالح (الامام المہدی) کا ظہور ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں اللہ کی زمین پر ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' کا قیام عمل میں آئے گا اس نقطۂ آغاز کا نقطۂ انجام یہ ہے کہ اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کے لیے کسی جدوجہد کے مکلف ہی نہیں ہیں۔

استدلال یا فریبِ استدلال

دین اور اس کے اصول و مقاصد سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو

بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور دلیل بھی اتنی زبردست جو مسلمان کی زندگی کا مقصد اور رویہ ہی بدل سکتی ہے اور جس نے افیون کی گولی بن کر کتنے ہی عوام اور خواص کو اپنے فریضۂ زندگی کی طرف سے غافل اور بے حس بنا رکھا ہے۔ اس لیے یہ واضح کر دینے کی بہرحال ضرورت ہے کہ یہ دلیل نہیں ہے بلکہ نفس کا یا پھر نگاہ کا ایک فریب ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ظہور مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے؟ اور دینی حقائق کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے قدرتاً ہماری نگاہ سب سے پہلے قرآن پر جاتی ہے مگر اس کے صفحات کو ہم اس کے ذکر سے بالکل خالی پاتے ہیں حالانکہ دین کی اصولی تعلیمات میں اس مسئلے کو اگر کوئی ایسی اہمیت حاصل ہوتی جو ہماری زندگی کے بنیادی فریضے پر ایک فیصلہ کن انداز میں اثر ڈال سکتی ہو تو عقل عام کہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو لازماً واضح ہدایتیں دیتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اس مسئلے کو دین اور دینی افکار و تصورات میں کوئی بنیادی اہمیت حاصل ہی نہیں۔ اور جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو امت مسلمہ کے مقصد وجود جیسے اہم ترین معاملے کے متعلق اسے کوئی فیصلہ کرنے کا حق دینا فکر و نظر کی زبردست کوتاہی ہے۔

اب قرآن کے بعد صحیح احادیث کی طرف رجوع کیجیے تو یہاں بھی اس کی کوئی مضبوط شہادت نہیں ملتی کیونکہ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتبِ احادیث میں ظہور مہدی سے متعلق ایک روایت بھی موجود نہیں ہے۔ نہ تو امام بخاری نے ان روایتوں کو قبول کیا ہے، نہ امام مسلم نے، اور نہ امام مالک نے۔ دوسری طرف ان روایتوں میں بھی جنھیں بعد کے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے شاید ہی کوئی روایت ایسی ہوگی جو محدثانہ معیارِ تحقیق پر بالکل بے داغ ثابت ہوتی ہو اور اس کا کوئی نہ کوئی راوی شیعہ یا شیعیت سے متاثر نہ نکلتا ہو۔ ان وجوہ سے بعض علما نے تو ظہور مہدی کی پیش گوئی یا بشارت کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا ہے اگرچہ یہ رائے ایک محتاط رائے نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس میں کوئی

بھی شک نہیں کہ معاملہ جس اہمیت کا ہے اس کے پیش نظر اس کی روایت زیادہ مضبوط سندوں سے ہونی چاہیے تھی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس معاملے کی کوئی خاص دینی اہمیت تھی نہ آپؐ کی ہدایتوں اور آپؐ کے علوم وارشادات کو باقی امت تک منتقل کرنے والے صحابہؓ کے نزدیک۔

لیکن ان تمام باتوں سے اگر صرف نظر بھی کرلیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اس خبر کا ان ذمے داریوں سے آخر تعلق کیا ہے جو اہلِ اسلام پر اقامت دین کے ضمن میں عائد ہوتی ہیں؟ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک مبارک دور آئے گا جب سطح زمین کے ایک ایک گوشے سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا۔ دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کی طرح ''خلافت علیٰ منہاج النبوت'' سارے عالم میں قائم ہوجائے گی۔ اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر اور طاغوت کی فرمانروائی مقدر ہوچکی ہے۔ اس پیش گوئی میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ ابتدائے اسلام کی تیس سالہ خلافت راشدہ کے اختتام سے لے کر ظہور مہدی تک زمین کے کسی خطے پر بھی اللہ کا دین قائم نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ اس دور سعید کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاتھوں مملکت اسلام میں قریب قریب ویسی ہی بہار سعادت پھر آگئی جو اس دور میں تھی اور اس زمانے کو بھی خلافت راشدہ کا زمانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جس پائے کی ظہور مہدی والی یہ روایات ہیں قریب قریب اسی پائے کی کچھ دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے اقامت دین کی کچھ اور تحریکوں کے اٹھنے کی پیشگوئیاں کی گئی ہیں اور مسلمانوں پر ان کی حمایت واجب قرار دی گئی ہے، مثال کے طور پر دو روایتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) اذا رایتم الرایات السود قد جاءت من قبل خراسان فاتوھا ولو حبوا علی الثلج فان فیھا خلیفۃ اللہ المھدی۔

جب تم دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے کالے جھنڈے آرہے ہیں تو وہاں پہنچنا۔ اگرچہ تمھیں برف

کے اوپر گھسٹ کر ہی کیوں نہ جانا پڑے اس لیے کہ ان کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

(۲) يخرج رجل من وراء النهر يقال له الحارث حراث على مقدمته رجل يقال له منصور يواطئ اويمكن لآل محمدٍ كما مكنت قريش لرسول الله صلى الله عليه وسلم وجب على كل مسلم نصره اوقال اجابته۔ (ابوداؤد۔جلد دوم)

ماوراءالنہر سے ''حارث حراث'' نامی ایک شخص نکلے گا جس کے آگے (یعنی جس کا سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہوگا۔ وہ آل محمدؐ کے لیے قوت اور اقتدار پیدا کرے گا۔ جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا تھا۔ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس کی مدد کرے یا یوں فرمایا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص، یعنی وہی ''مہدی موعود'' ہیں۔ کیونکہ مہدی موعود کا ظہور جیسا کہ روایات کا بیان ہے' مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراءالنہر یا خراسان سے۔ اسی طرح ان کا نام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہوگا (نہ کہ حارث حراث) نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے جلو میں نکلیں گے' نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر۔ پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہیے کہ ان روایات میں حصر ہوگیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں ان تمام داعیانِ حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا علم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ اس کے بخلاف ان روایتوں میں صرف بعض افراد اور چند زمانوں کا ذکر کیا گیا ہے اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہوگا کہ اقامت حق کی اس مہم سے اپنے کو وابستہ کر دے۔

غرض ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدیِ موعود کے ماسوا بھی حق کے کچھ علمبرداروں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل چل کر ان کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ کیا یہ بات بھی اس بے بنیاد تخیل کا کھوکھلا پن واضح نہیں کرتی کہ اب مہدی موعود کے آنے سے پہلے قیامِ دین کی جدوجہد سے امت فارغ البال قرار پا چکی ہے؟

پھر اس مسئلے پر اصولی حیثیت سے بھی غور کیجیے اور دیکھیے کہ ایک بنیادی فریضے کی خود اپنی نوعیت کیا چاہتی ہے؟ جب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین ہی ہر مسلمان کی زندگی کا تنہا مقصد ہے۔ جب اس فریضے کی خاطر جدوجہد کرنا ہی اس کے ایمان کی کسوٹی ہے، جب مومن کا اصل مزاج ہی یہ بنایا گیا ہے کہ باطل اور منکر سے ابدی بیر ہے اور اسے وہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی موجود دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے کہ مسلمان کی سعی وجہد اس وقت تک نہ رکنی چاہیے جب تک کہ دین حق کی کوئی ایک دفعہ بھی معطل ہو' یا زمین کا کوئی ایک ذرّہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا پڑا ہو۔ تو ہر مومن کو اپنے طور پر یہ جدوجہد لازماً کرنی ہی پڑے گی۔ اور ہر حال میں' ہر دور میں' ہر ماحول میں اور ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی جب آئیں گے تو وہ فرض اپنا ادا کریں گے نہ کہ میرا اور آپ کا۔ ان کی تمام دوڑ دھوپ صرف اپنے اس بوجھ کو اتارنے کے لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے خود ان پر ڈالا گیا ہوگا۔ کسی دوسرے کا بوجھ وہ اپنے سر نہ لیں گے اور نہ لے سکیں گے۔ اس لیے ان کی سعی وجہد کسی بھی دوسرے مدعیِ اسلام کے ادائے فرض کی قائم مقام نہ ہوگی۔ جس طرح وہ کسی دوسرے کی طرف سے نہ تو نماز پڑھیں گے' نہ روزے رکھیں گے۔ اسی طرح وہ کسی کی طرف سے اقامت دین کی جدوجہد بھی نہ کریں گے۔ آپ تو آج ہی سے ان کی جدوجہد پر تکیہ کر کے بیٹھ گئے ہیں جب کہ ان کا وجود عالم تصور اور دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے مگر یقین کیجیے کہ وہ اس وقت کے بھی کسی مسلمان کی طرف سے کوئی دینی فریضہ ادا نہ کریں گے جو ان کے اپنے زمانے میں موجود ہوگا۔ اس وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا فرض ٹھیک اسی طرح خود ہی ادا کرنا ہوگا جس طرح کہ امام موصوف کو اپنا فرض۔ یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں ہر ''شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی ہوگی'' اور جو ایسا نہ کرے گا ''آسمانی بادشاہت'' میں داخل نہ ہو سکے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیے کہ اس کو کوئی ایسا دور سعادت دیکھنا نصیب ہو جس میں ظلم وفساد کے بوجھ

سے کراہتی ہوئی دنیا امن اور انصاف کی رحمتوں سے باغ و بہار بن جائے۔ مگر کسی ایک لمحے کے لیے بھی خوش فہمی کا یہ فریب نہ کھانا چاہیے کہ کسی نئے آنے والے مرد کامل کے صدقے میں اب سارے مسلمان بندگی کی بنیادی ذمے داری........... اقامتِ دین کی جدوجہد .... سے سبکدوش کر دیے گئے ہیں ورنہ یہ کچھ ویسا ہی ہوگا جیسا کہ عیسائی حضرات نے گمان کر رکھا تھا کہ مسیح نے سولی پر چڑھ کر ہم سے عمل کی ذمے داریاں ساقط کرا دی ہیں۔

احتسابِ نفس کی ضرورت

اقامت دین کی جدوجہد سے دامن بچانے کے حق میں جو مختلف ''فلسفے'' پیش کیے جاتے ہیں' اوپر کی مفصل معروضات میں ان کا اور ان کے استدلالی وزن کا حال آپ نے دیکھ لیا۔ اگر ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گروہی' سیاسی اور تقلیدی تعصّبات سے بالاتر ہو کر خالص حق پسندانہ نقطۂ نظر سے اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لیا جائے تو توقع ہے کہ وہ تاریکیاں ضرور چھٹ جائیں گی جو غفلت اور کج فکری کی بدولت نہ جانے کب سے ہمارے ذہنوں پر چھائی چلی آ رہی ہیں۔ اور جنھوں نے ہمارے مقصد وجود کو ہماری نگاہوں سے اوجھل بنا رکھا ہے مگر بھولنا نہ چاہیے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نامرغوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق ہوتا ہے اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکشِ دجل کا آخری تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے جو اس سے قربانیوں کی طلب گار ہو۔ صرف جان اور مال ہی کی قربانیوں کی نہیں بلکہ جذبات و میلانات کی قربانیوں کی بھی۔ پندار علم و فہم کی قربانیوں کی بھی' سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی قربانیوں کی بھی کہ بسا اوقات ان چیزوں کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر سے نور حق کی تجلی دکھائی دیتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے اور ادھر نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب تک کی تیری ساری دوڑ دھوپ باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے شیوخ و اکابر اور وقت کے ارباب علم و دانش جن راہوں پر چل رہے ہیں وہ سب کی سب

''ترکستان''، ہی کی طرف جاتی ہیں؟ یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے ایسے مسلح ہوتے ہیں کہ انسان ان کا شکار ہو جانے سے بہت کم بچتا ہے اور انجام کار ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق تسلیم نہیں کرتا۔ یہ نفس انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہمیشہ سے اطاعت کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کراتی رہی ہے کہ:

بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط البقرہ 170:2

بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

اس لیے اگر راہ حق و صواب کی سچی طلب ہو تو ضروری ہے کہ نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے انسان پوری طرح چوکنا رہے اور اس عظیم اصول کو ہرگز نہ بھولے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے......... بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے اور نہ کوئی جماعت ہے......... سوائے ایک جماعت کے' جس کو دنیا اصحاب محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے ورنہ وہ اپنے فکر و عمل کا بے لاگ احتساب کر ہی نہیں سکتا اور جب تک یہ توفیق میسر نہ ہو ہدایت یابی کی توقع ہی فضول ہے۔ اس لیے مسئلۂ زیر بحث کے سلسلے میں صرف اللہ کی کتاب، اس کے رسولؐ کی سنت اور اصحابِ رسولؐ کا اُسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ اگر حق اور ہدایت کے ان سرچشموں میں ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر سانس اقامت دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کام کے لیے اپنے کو وقف کر دیجیے' اور ہر اس چیز کو ٹھکرا دیجیے جو اس عزم کی مزاحمت کرے۔ خواہ وہ کسی پیر و مرشد کی ارادت ہو یا کسی شیخ و امام کی عقیدت' کوئی جماعتی رشتہ ہو یا اب تک کا طرز فکر و عمل۔ یہ چیزیں اگر اس صراط مستقیم پر قدم بڑھانے سے روکتی ہیں تو باور کیجیے کہ یہ سب نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں اور قدرت نے ان کو انسان کے لیے صرف اس مقصد سے پیدا کر رکھا ہے کہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آ جائے ورنہ یاد رہے کہ کوئی عقیدت' کوئی ارادت' کوئی رشتہ اور کوئی تاویل بھی ہم کو خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتی۔ جب تک راز حق دل پر نہ کھلا ہو اس

وقت تک تو انسان کسی حد تک معذور مانا بھی جا سکتا ہے مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آ گئی اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو سمجھ لیجیے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اعتذار کے سارے دروازے بند ہو گئے۔ اب آ گے یا تو آمادگیِ عمل اور کامرانیِ حیات ہے' یا پھر فرض کا انکار اور نامرادی کا عذاب کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے منہ موڑنا اس سنت فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کا تذکرہ قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:

فَلَمَّا جَآءَتۡهُمۡ اٰيٰتُنَا مُبۡصِرَةً قَالُوۡا هٰذَا سِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ ۝ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا ؕ النمل 27:14-13

جب ان کے سامنے ہماری واضح نشانیاں آئیں تو انھوں نے کہا یہ صاف جادو ہے اور باوجود اس کے کہ ان کے دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر ان کا انکار کر دیا۔

اور اس سنت کی پیروی کا جو انجام ہو سکتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ اس لیے اگر اپنی دنیا کو برباد اور آخرت کو تباہ نہ کرنا ہو تو اسے اختیار ہی کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تو اس کے لیے آخری چارۂ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے صرف یہ ہے کہ وہ جہاں ہے وہیں قدم روکے کھڑا رہے اور اگر کوئی پوچھنے والا اس سے پوچھے تو اسے ضرور بتا دے کہ اگرچہ مجھے اس پر چلنے کی عملی توفیق حاصل نہیں' مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور ترک فرض کے ساتھ ساتھ کتمانِ حق کے جرم میں بھی نہ پکڑا جائے اور اگر بدقسمتی سے اس میں اتنی جرأت بھی نہ ہو تو پھر اپنے قدموں کی طرح اپنی زبان کو بھی روکے رہے اور کسی حال میں بھی دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا وبال اپنی گردن پر نہ لے۔ کیونکہ یہ رویہ کھلا ہوا صد عن سبیل اللہ ہے اور صد عن سبیل اللہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہییں۔

اس موقع پر اس بحث میں جانا فضول ہے کہ آج امت مسلمہ کا کوئی فرد یا گروہ اس بدبختی میں مبتلا ہے یا نہیں؟ کیونکہ یہ صورت حال اگر آج موجود نہیں ہے تو کل موجود ہو سکتی ہے۔ یہ اندیشہ پیش رَو امت کے اس عملی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے قطعاً بے بنیاد نہیں جس کا عکاسی حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اس طرح کی تنقیدوں میں فرما گئے ہیں:

اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ (متی باب ۲۳)

ویسے دعا یہی ہے کہ خدا وہ دن کبھی نہ لائے جب کوئی مسلمان حق دشمنی کی اس لعنت میں مبتلا نظر آئے۔

☆......☆......☆......☆......☆